

ادب کا مقصد



# مصنف کی دوسری کتابیں

- ۱۔ کلیاتِ دلی (طبع ثانی) ۱۹۴۵ء
- ۲۔ سیاسی نظریے ۱۹۴۶ء
- ۳۔ دلی کا دبستانِ شاعری ۱۹۴۹ء
- ۴۔ ناول کیا ہے بزرگ ڈاکٹر محمد احسن قادری ۱۹۵۱ء
- ۵۔ کلیاتِ دلی (طبع سوم) ۱۹۵۴ء
- ۶۔ ترجمہ کنیڈ ڈا ۱۹۵۴ء
- ۷۔ ایک نادر روزنامہ ۱۹۵۴ء
- ۸۔ ادب کیا ہے؟ ۱۹۵۶ء
- ۹۔ نو طرزِ مرصع زیرِ طبع





# ادب کا مقصد

از

دکٹر سید نور الحسن ہاشمی





ہندوستان کتاب گھر

لکھنؤ



چلنے کا پتہ

مبارک بک و ڈپو

بندر روڈ مقابل ڈسینو ہال - کراچی ۷



سنسکرت قومی پریس لکھنؤ

بار اول

۱۹۵۶ء







# ترتیب

- ۱ ادب کا مقصد ۹
- ۲ ملک الشعراء ذوق ۲۵
- ۳ مومن کی غزل گوئی ۶۷
- ۴ مومن کے کلام میں جرأت کا رنگ ۸۲
- ۵ غالب کی قدر ۹۹
- ۶ اقبال کا نوجوان اور اس کی تعلیم ۱۲۵
- ۷ خطوط واجد علی شاہ ۱۵۹
- ۸ علم عروض، صوتی اعتبار سے ۱۹۴



# تعارف

یوں تو میرا سب پہلا مضمون نگار کے ستمبر ۱۹۳۱ء کے شمارہ میں نکلا تھا لیکن باقاعدہ مضامین لکھنے کی نوبت ۳۴ء سے آئی۔ اُس وقت سے اب تک جو مضامین لکھے گئے ان کا ایک انتخاب یہاں پیش کیا جا رہا ہے، ذوق اور موہن پر جو مضامین ہیں اُن میں تو ان کی شاعرانہ خصوصیات کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے اقبال کے یہاں سے صرف ان کے ایسے کلام کو منتخب کیا گیا ہے جس میں انھوں نے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کی طرف اشارے کیے ہیں اور اس بارے میں جو اُن کے خیالات ہیں انھیں تفصیل سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ غالب کی قدر کے سلسلے میں ممکن ہو کہ بعض لوگ میرے خیال سے اتفاق نہ کریں کیونکہ میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا جس قدر قائل ہوں اتنا اُن کی شخصیت کا نہیں، میرے خیال میں غالب کی طبیعت میں اُن کے پہلے معنوی استاد تبدیل کی کسی قناعت نہ تھی۔ وہی تبدیل جن کے کم از کم یہ شعر آپ نے سُنے ہوں گے۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجائے خویش      من بستہ ام خنائے قناعت بہ پائے خویش  
در ہائے فردوس و ابوداؤد مسرور      از بے نیازی گفتیم، فسرور  
اپنے خاندانی اور نسلی خصوصیات کے تحت غالب نے ایک شاہانہ یا عیشی امروز والادل و دماغ پایا تھا۔ ان میں قناعت طبعاً نہیں تھی اگر کہیں ظاہر بھی ہوئی ہو تو وہ قال ہے حال نہیں، اگر وہ عشرت سے گزر کر نہ کی نگر میں نہ ہوتے تو غالباً ان کی تنخواہ اور دیگر فتوح سے اُن کی گزراوقات بفرغت ہو سکتی تھی یہ ضرور ہو کہ مادی طور پر اُن جیسے شاعر کی قدر نہیں ہوتی لیکن ان کی شہرت تو کسی طرح کم نہ تھی۔ ان کی قدر آئندہ



ہندوستان میں کیسی ہوگی، تو یہ ظاہر ہے کہ اگر اردو زبان بیاں باقی رہی تب تو ان کی قدر کا سوال اٹھے گا ورنہ نہیں۔ ابھی جو مرزا غالب نامی فلم بنا تھا اور جس پر حکومت ہند سے پہلا انعام بھی ملا تھا بیاں لکھنے کے ایک سینما ہال میں یہ حالت تھی کہ لوگ غالت گت بہت صاف اور سیدھا اشتار کا مطلب بھی ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے انہیں کہ اب لوگ فارسی کی محولی اضافتیں بھی بھولے جا رہے ہیں۔

واجد علی شاہ کے جو خطوط اس مجموعے میں پیش کئے جا رہے ہیں وہ غیر مطبوعہ ہیں اور اتفاق سے میرے ہاتھ آ گئے تھے۔ اردو خطوط انہی میں واجد علی شاہ کے خطوط یقیناً جو مقام رکھتے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے امید ہے کہ یہ خطوط ضرور اہم سمجھے جائیں گے۔ علم عروض کو صوفی انداز میں پیش کرنے کا تجربہ شاید کچھ نیا معلوم ہو یہ انگریزی عروض کے طریقے پر ترتیب دیا گیا ہے اس طلباء کو یا ان حضرات کو جو علم عروض سمجھنا چاہتے ہیں یقیناً آسانی ہوگی اور اس کے مطالعہ کے بعد وہ عروض کے دیگر عجیب و غریب نکات کو اس فن کی مستند کتابوں سے بخوبی سمجھ سکیں گے اس مضمون کو اس فن کا محض نیا تعارف سمجھنا چاہیے۔

ادب کا مقصد میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی میں جو جھگڑا ہے وہ بے کار سا ہے دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ادب برائے ادب کا مقصد اگر حسن آفرینی ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے بغیر کوئی ادب ادب ہی نہیں کہا جاسکتا، لیکن یہ حسن آفرینی مقصد بالذات نہ ہونا چاہیے یا اسے آخری منزل نہ شمار کرنا چاہیے بلکہ ایک ادیب یا شاعر کو اسے صرف پہلا زینہ سمجھنا چاہیے یعنی اسے وہ محض مشقِ سخن سمجھے اور پھر جب حتی الوسع اس فن پر عبور حاصل کرے تو پھر وہ چیزیں پیش کرے جو زندگی میں اہم قدر و قیمت رکھتی ہیں کیونکہ بغیر زندگی کے تاروں کو چھوئے کوئی ادب یا ادب پارہ جاندار اور پائدار غمہ پیش نہیں کر سکتا۔

نور الحسن ہاشمی  
لکھنؤ یونیورسٹی

۱۳ اکتوبر ۱۹۵۶ء



## ادب کا مقصد

آدمی کی زندگی مرکب ہے جذبات و احساسات، ذکر و فکر، ہوش و خبر، ثبوت و اعمال سے، لیکن ادب کا بنیادی تعلق محض جذبات و احساسات سے ہے۔ جذبات و احساسات سے متاثر ہونے یا ان کو متاثر کرنے ہی کا نام ادب ہے۔ یہ تعلق اس قدر عام ہے کہ اس کی کچھ نہ یادہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ جب زندگی اور ادب کا تعلق اس قدر معروف ہو تو ادب کا مقصد متعین کرنے سے پہلے ہمیں زندگی کا مقصد متعین کرنا ہو گا۔

زندگی کا مقصد اصلی بقائے زندگی ہے۔ بقائے زندگی کے معنی ہیں کہ زندگی کو کسی نہ کسی طرح برقرار رکھا جائے۔ زندگی ایک تو ذاتی اور انفرادی حیثیت رکھتی ہے دوسری بنی نوع کی یا جماعتی حیثیت۔ بعض جگہ ذاتی زندگی کو برقرار رکھنے کا نام ہی جماعتی زندگی کو برقرار رکھنا ہے۔ یعنی صرف "جیو" پر زور دیا جاتا ہے اور بعض جگہ خصوصاً مشرق میں جماعتی زندگی کو برقرار رکھنا فرضِ اولین سمجھا جاتا ہے اور اسی میں فرد کی زندگی کا قیام سمجھا جاتا ہے یعنی "جیو" سے پہلے "جینے دو" پر زور



دیا جاتا ہے۔

بقائے زندگی ممکن کیونکر ہے؟ فطرت کے پاس اس کا صرف ایک طریقہ ہے یعنی تخلیق، مسلسل تخلیق، موت سے اسے کوئی واسطہ نہیں یہ مسلسل تخلیق کئے جاتی ہے بے تکان اور بڑی شد و مد سے اس تغل میں مصروف رہتی ہے، کوہِ دھرا۔ قطرہ و دریا۔ آبادی ویرانے، خشکی و تری کہاں یہ مصروف کار نہیں۔ ایک آ بشار کے مانند جلائی و جمالی شان کے ساتھ یہ حیات ہر جگہ رواں دواں، موجود اور مصروف نظر آتی ہے۔ ہم لوگ اس طریقہ تخلیق کو "جنسیت" کی اصطلاح سے نامزد کرتے اور سمجھتے ہیں۔ یہی جنسیت ہمارے ادب میں کہیں فلسفہ محبت کا بلند بانگ نام اختیار کرتی ہے۔ کہیں محض جراتِ رندانہ کہلاتی ہے لیکن فطرت کی یہ کاروائی تخلیق اس کی اپنی ہے۔ ہماری نہیں۔ ہم اس کے ہاتھوں مجبور محض ہیں لیکن ہمیں اختیار اس وقت ضرور مل جاتا ہے جب ہم تخلیق میں آ جاتے ہیں۔ اس وقت ہم کم از کم اتنے تو با اختیار ہو جاتے ہیں کہ اس زندگی کو اپنے قالبِ خاکی میں برقرار رکھ سکیں۔ کم از کم اتنے عرصہ تک جب تک اس مستعار قالب میں باقی رہنے کی سکت ہے یا جس حد تک اس مستعار قالب کی ودیعات اس قابل ہیں کہ برقرار رکھی جا سکیں۔ اس لئے ہم کوشش اسی کی کرتے رہتے ہیں کہ اپنی زندگیوں کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک اور زیادہ سے زیادہ بہتر صورتوں میں برقرار رکھیں اسی کوشش کا دوسرا نام "تدنی تاریخ" ہے اور اسی جدوجہد کی آخری منزل کا نام



”جنت“ ہے۔

ان حیاتی اور سماجی اصولوں کی تشریح کے بعد انسان کی جذباتی اور حسی کیفیتوں کے اصولوں پر بھی نظر ڈال لی جائے۔ جن کا تعلق براہ راست ادبیات سے ہے۔ انسان کی جذباتی اور حسی زندگی بھی چند اصولوں کے مطابق کٹتی ہے۔ یہ اصول اُن جذباتی اور نفسیاتی تجربوں کو پیش نظر رکھ کر بنائے گئے ہیں جو ہماری زندگی میں ضرور پیش آتے ہیں۔ اور اب بمنزلہ قوانین کے ہو گئے ہیں اصطلاح میں انھیں اصول نفسیات کہا جاتا ہے۔ ان اصولوں میں سے ایک بنیادی اصول خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

انسان ہر حالت میں برتر رہنا چاہتا ہے۔ یہ خودی یہ رفعت اور برتری کی خواہش ایک ایسی بنیادی جبلت ہے جو ہر جگہ ہر دول میں اور ہر ذی روح میں کار فرما ہے۔ ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کا طلسم رنگین اور دنیا کی ہماہمی اسی خلش برتری کی رہین منت ہے۔ انسان ہر حالت میں برتر رہنا چاہتا ہے، وقتی مجبوریوں کی اور بات ہے، جسے مصلحت کہہ لیجئے ورنہ خوشی سے کوئی انسان اپنے کو حقیر سمجھنا کبھی نہیں چاہتا۔ ہر نفس میں یہ کاوش ہر لمحہ موجود رہتی ہے۔ ہماری کش مکش۔ جدوجہد۔ نعرہ ہائے دہور سب اسی کی وجہ سے قائم و دائم ہیں چنانچہ آدمی جب زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کی انفرادی خودی دوسرے لوگوں کی خودی سے ٹکراتی ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو فخر و مباہات کا



تسکین پذیر جذبہ اس کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر نا کامیاب رہا تو اس احساس کمتری پر غم و غصہ، رشک و حسد کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ جب آدمی نا کامیاب رہتا ہے تو اسے اپنی نا کامیابی تسلیم نہیں کرتا۔ اور اس احساس شکست کو بھلا دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس سے اس کے احساس برتری کو تکلیف ہوتی ہے۔ اور نفس اس خاص وجہ تکلیف سے فرار ہو کر دوسرے میدانوں میں سرگرم کار ہو جاتا ہے۔ اس خاص صورت کو علم نفسیات میں گریز کہتے ہیں۔ گریز کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن عام طور سے جو شکل نفس اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ غم روزگار بھلا یا جاتا ہے شاید شراب میں۔

جو غم ہوا اُسے غم جاناں بنا دیا

یا  
دلِ داغِ دنیا غمِ معشوق بود

بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہ ما (عرفی)

تمام دنیا کی شاعری کا عموماً اور ایشیائی شاعری کا خصوصاً بیشتر حصہ اسی قاعدے کے تحت وجود میں آتا رہا ہے اور جس کی بہترین مثالیں حافظ اور خیام کی شاعری میں ملتی ہیں۔

کبھی یہ غم روزگار بھلا یا جاتا ہے تھوٹ اور واقفیت میں دنیا کی

شاعری کا ایک معتد بہ حصہ اسی جذبے کے تحت ظہور میں آیا ہے، عطار، رومی، سنائی، ٹیگور، تارکس خوریلیاں کے ملفوظات اس کی نمایاں



مثالیں ہیں۔ ہماری اردو شاعری میں درد اور راسخ عظیم آبادی اس صفت میں مشہور ہیں، ورنہ اس موضوع کے اچھے اشعار ہمارے دیگر اچھے شاعروں کے ہاں بھی بکثرت ملتے ہیں۔

مزا جوں میں یاس آگئی ہے ہمارے

نہ مرنے کا غم ہے نہ جینے کی شادی (تمیز)

گر خجہ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ

یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ (غالب)

غیر معمولی حالتوں میں نفس اگر ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی اختیار نہیں کرتا یا کسی طرح سے اپنا غم غلط نہیں کرتا۔ کسی طرح اس کا ماتم نہیں کر لیتا جیسے سودا نے شہر آشوب لکھ کر کیا، تو نا کامیابی کے غم و غصہ میں اس کے لئے سوائے موت کے اور کوئی صورت رہائی کی نہیں رہ جاتی۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ”گریز“ بھی نیند کی طرح زندگی کی بقا کے لئے از حد ضروری اور ایک بالکل فطری چیز ہے۔

اب ادب کیا ہے اس کی بھی اجماعی تشریح یا تعریف کرنی لازم ہے ادب وہ سخن ہے گفتنی یا شنیدنی ہیں جو اپنی موضوع کی جدت اور دیا، حسن بیان کی چمک کے باعث لائق کشش ہوتے ہیں۔ یا ادب نام ہے کسی حقیقت کے حسین ترین اظہار کا۔ ادب ایک چمکتا ہوا سوچ ہے جس میں حرارت اور چمک دونوں ہونا ضروری ہیں۔ بعض اوقات لوگ محض چمک ہی سے مسحور ہو جاتے ہیں لیکن سچا اور پائدار ادب وہی ہے



نہیں حرارت بھی ہو۔ ورنہ خالی چمک و تک چاند کی روشنی کی طرح محض  
خالی اور شراہ کی چمک کی طرح و قتی ہوتی ہے۔ حرارت کا تعلق ادیب  
کے دل و دماغ سے ہوتا ہے۔ چمک یا جھلک کا تعلق اس کے فن سے۔  
لیکن بیان ہمارا موضوع اس کے دل و دماغ سے وابستہ ہے۔ اسلئے سخن یا  
فن کا یہی پر گفتگو بیان خارج از بحث ہے۔

ادیب کے دل و دماغ کا غیر معمولی حالت میں ہنا ادیب کی تخلیق کے  
لئے اول شرط ہے۔ کیونکہ جذبات اور احساسات میں ایساں یا غیر معمولی سکون  
اُسی وقت پیدا ہوگا جب انسان کی ذہنی کیفیت غیر معمولی ہو اور اس وقت  
اس کے نطق سے جو فشار ہوگا وہی ادیب کے لئے گاہ انسان کے ذہن کی  
غیر معمولی کیفیت اسی وقت ہوتی ہے جب اس کا ذہن محسوس کرے کہ دنیا اس کے  
حسب فشار نہیں چل رہی ہے، انفرادیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب  
لگاؤ میں اور مشکلیں اس کی راہ میں حائل ہو جائیں۔ ذہن کو اپنی برتری کا  
احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب یہ وقتیں اس کی راہ میں مزاحم ہوں  
اسے کوئی سخت روحانی تکلیف ہو اور وہ ذہنیت اس وقت اپنے کو  
کمزور سمجھے یا سمجھنے پر مجبور کی جائے تو اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ  
ادیب ایک کمزور آدمی ہوتا ہے یا اس وقت کمزور ہوتا ہے جب وہ ادیب  
ہوتا ہے۔ طاقتور آدمی کو نہ ادیب کی ضرورت ہوتی ہے نہ ادبیات کے  
لئے فرصت، ایک طاقتور آدمی ایک ادیب ہو سکتا ہے لیکن صرف اپنی  
رہنمائی یا واقعی کمزوری کے لحاظ سے۔ ہر بظاہر کمزور لیکن بہ باطن طاقتور

















































































































































































































































































ہر ایک کو خوش کرتا نظر آئے گا۔ اگر پہلے ذوق کی غریبیں اور باب نشاط گاتے تھے اور غالب کو کوئی پوچھتا نہ تھا۔ تو آج مشاق گوئیے، اگر انجمن ریکارڈ فلمی گانے اور ریڈیو پر ہر طرف صرف غالب کی غزلیں بچتی اور گائی جاتی ہوئی ملیں گی۔ اس سے ظاہر ہے کہ علومِ ناطق نہ صرف خواص میں بلکہ عوام میں بھی اب کافی مقبول ہو گیا ہے۔ غرض کہ غالب کی قدیم منزلہ موجودہ دور میں درجہ کمال پر پہنچی ہوئی ہے اور وہ غرابت جو بیدل کے رنگ کی وجہ سے نامانوس تھی اب حل ہو کر مقبول خلوت ہو گئی ہے۔

لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ باقی رہے گی۔ کیا عدا یاں گزر جائیں گی پر بھی غالب اتنا ہی اور اسی قدر مقبول اور منظور نظر رہے گا۔ اگر انہی کا حال ہم نہ دیکھ چکے ہوتے تو ممکن تھا ہمارا ذوق احتیاد یہ کہنے پر مائل کر دیتا کہ شاید ہی کوئی ایسا زمانہ آسکے جس میں غالب مقبول ہو لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہاں ایسا زمانہ بھی گزرا ہے۔ اور پھر آسکتا ہے جب غالب کا راسخا عربی غیر مقبول اور غیر معروف ہے۔ لہذا یہ صحیح کہ زمانہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اور تیر زمانہ کے آب و گل میں ہے، اب بھی بہت سے پرانے حضرات ایسے باقی ہیں جنہیں غالب کے اشعار میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی اور وہ تاریخ کے کلام پر سر دھنتے ہیں لہذا کیا یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ کلامِ غالب ہمیشہ ہمیشہ اسی شد و مد کے ساتھ قائم رہے گا یا اس کی موجودہ قدر و منزلت قائم رہے گی، اور اگر قائم رہے گی تو کس حد تک؟

اگر زمانہ الٹی گردش نہیں کرتا اور لوگ پھر ایک دم جاہل نہیں ہو جاتے

نہ۔ غالب پر فلم بھی بن گیا ہے (۱۰)



یا پھر یہ کہنے نہیں لگ جاتے کہ کس طرح کہا ہے بجائے اس کے کہ کیا کہا ہے۔ حالانکہ ادب میں کس طرح، کو اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کیا، کو ہے لیکن کسی ایک نقطہ نظر کو حقیقت سے کوسوں دور نہیں ڈالا جاسکتا، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دیکھنے کے لیے کہ اشعار غالب اتنے ہی مقبول رہیں گے کہ نہیں رہیں یہ دیکھنا پڑے گا کہ غالب نے کیا کہا، اور کس طرح کہا ہے، آیا جو کچھ کہا ہے وہ باقی رہنے والی چیز ہے یا فنا ہو جانے والی۔ آیا جس طرح کہا ہے کیا وہ چیز اس سے بہتر طریقے پر بھی کہی جاسکتی ہے یا کہی جاسکے گی؟ ان سوالات کا جواب دینا کوئی آسان بات نہیں۔ پھر بھی اتنا کہا جاسکتا ہے کہ جب تک انسان کے پہلو میں دل ہے اور دل میں محبت تب تک مشکل ہے کہ ذیل کے اشعار اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کر کے اسے لطف و تسکین نہ دے سکیں۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں  
نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں

جس کے بازو پر تری زلفیں پر لیشاں ہو گئیں  
رہے اُس شوخ سے آرزو ہم چندے تکلف سے

تکلف بر طرف تھا ایک اندازِ حسنوں وہ بھی  
اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق !

وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حالی اچھا ہے  
لاکھوں لگاؤ ایک چراتا نگاہ کا  
لاکھوں بناد ایک بگڑنا عتاب میں



دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پر شک آجائے ہے

میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

قمر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو کاش کے تم میرے لئے ہوتے

قیامت ہے کہ ہر دے مدعی کا ہم سفر غالب

وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

بوتے گل نالہ دل دو چراغ محفل جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غلب کہ لگنے نہ گئے اور بجھائے نہ بنے

سادگی و پرکاری، بخود دی و بھاری حسن و خفاں میں جرأت آزما پایا

مانگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہوس زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

بارے آرام سے ہیں اہل حفا میرے بعد روالی غزل

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا

پرکشش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

یا جب تک دماغ میں سوچنے کی اور دل میں راز حقیقت کے سمجھنے کی کاوش موجود

ہے (یا جب تک کوئی باہر آکر ان سب رازوں کو آشکارا نہیں کر دیتا) اس وقت

تک نامکن ہے کہ غالب کے ذیل کے اشعار ہر مفکر کے دماغ میں کبھی نہ کبھی

جگہ نہ پالیں۔

محرم نہیں ہے تو ہی نوائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہر ساز کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا



قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم جلا دے ڈرتے ہیں نہ داغ و خا سے جھگڑتے باز یچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے اک کھیل ہے اوزنگ سلیمان مرے نزدیک ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم مشہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں چلتا ہوں تھوڑی دیر ہر اک تیز رو کے ساتھ

پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ نگہ چشم سر سر سا کیا ہے؟ پھر یہ ہنگامہ لے خدا کیا ہے؟ ہر چند کہیں کہ ہے۔ نہیں ہے! ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا سمجھو د اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے سبزہ دگل کہاں سے آئے ہیں شکن زلف عنبریں کیوں ہے جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود اں کھائیو مت فریب ہستی ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد

عالم تمام حلقہٴ دایم خیال ہے ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے ہے تجلی تری سامان وجود ذرہ بے پر تو خورشید نہیں



دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود ہیں  
 قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں  
 یا جب تک انسان کے خمیر میں ظرافت اور شوخی کا مادہ موجود ہے اور ایسی باتوں  
 سے اس کے دل میں گدگدی پیدا کی جاسکتی ہے اس وقت تک غالب کے یہ  
 اشعار اس کو مسکرا دینے پر ضرور مجبور کر دیں گے۔  
 ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکمیرین

ہاں منہ سے مگر بادہ دد شینہ کی بو آئے  
 وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اسے خضر

نہ تم کہ چو رہنے عمر جا د داں کے لئے  
 وعدہ آنے کا وفا کیجئے یہ کیا انداز ہے

تم نے کیوں سوچنی ہے اپنے گھر کی در بانی مجھے  
 میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تھی

سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں  
 بہرا ہوں میں تو چاہیے دوتا ہوا التفات

سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر  
 دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے

یارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا  
 چاہتے ہیں خبر دیوں کو اسد آپ کی صوت تو دیکھا چاہئے



کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی گھر ترا خلد میں گر یا د آ یا  
 یا جب تک غم کو انسان سے اور انسان کو غم سے تعلق ہے اس وقت تک غالب  
 کے مندرجہ ذیل اشعار کبھی نہ کبھی زبان سے نکلے بغیر نہ رہیں گے۔

قید حیات بند و غم اصل میں دو ذوں ایک ہیں  
 موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں  
 ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے  
 جسے نصیب ہو روزیہ میرا سا وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیوں کر ہو  
 بے سبزہ زار ہر در و دیوار مسکدہ  
 زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب  
 ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

کیوں گردش مدام سے گھبرانہ جائے دل  
 انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل  
 دیکھ کر طرزِ تپاک اہل دنیا جل گیا  
 بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالب  
 غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج  
 یا جب تک انسان دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اس وقت تک  
 غالب کے عمر بھر کے تجربے کبھی نہ بھلائے جاسکیں گے۔



ہیں کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا  
دشوار سے خود گر ہوا انسان تو مت جانتا ہے رنج

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آسان ہر گئی  
اور بازار سے لے آئے اگر ڈوٹ گیا جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے  
سیفۃ جب ککنار سے پہ آ لگا غالب خدا سے کیا قسم دجو رنا خدا کہیے  
حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو

کہ چشم تنگ شاید کثرتِ نظر رہ سے دا ہو  
یا جب تک انسان میں کبھی کبھی لا ابالی پن، رندی اور آزادہ ردی کے خیالات  
موجزن ہو کر اُسے دنیا دما فیہا سے بلند کر سکتے ہیں اُس وقت تک یہ رنگینیاں فراموش  
نہ ہو سکیں گی۔

تانش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا  
وہ اک گلدستہ ہے ہم بخودوں کے طاق نیاں کا  
قرض کی پیتے تھے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں

رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن  
مے سے غرض نشاط ہے کس رویا کو اک گونہ بخود می مجھے دن رات چاہیے  
پلاٹے ادک سے ساتی جو ہم سے نفرت ہے پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے  
یا جب تک تشبیہ و استعارات میں اثر ہے اور بات شیشہ و ساغر کے بغیر نہیں بنتی،  
یا جب تک طرزا داک کی ندرت دلوں کو بھاسکتی ہے اُس وقت تک ذیل کے  
اشعار کیونکر فراموش ہو سکیں گے۔



غیم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج  
 شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک  
 بجلی اک کو ند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا  
 بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا  
 پنہاں تقادیم سخت قریب آشیانے کے  
 اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے  
 منحصر مرنے پر ہو جس کی امید  
 ناامیدی اس کی دکھایا چاہیے  
 نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا  
 آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد  
 مجھ سے مرے گنہ کا حساب لے خدا نہ مانگ  
 نظر لگے نہ کہیں اسکے دست و بازو کو  
 یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں  
 ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے  
 دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں  
 وفاداری بشرط استواری اصل ایساں ہے

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑ دیرہن کو  
 طاعت میں تار ہے نہ مے دا بگیس کی لاگ  
 دوزخ میں ڈال دو کوئی کے کرہشت کو

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا  
 میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرا دل میں ہے  
 اور بازو سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا  
 جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے  
 تاکر وہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد  
 یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے  
 دریائے مہا صی تنک آبی سے ہو خشک  
 میرا سردامن بھی ابھی تر نہ ہوا ہوتا  
 یا جب تک ثقیل الفاظ بلا اختلال معنی اور رواں افسان و خیزاں بھریں آواز کی  
 ترتیل سے موسیقیت پیدا کر سکتی ہیں اس وقت تک کہ اب نشاط ذیل کی غزلوں کے



محل رچانا کیونکر چھوڑ سکیں گے۔

درد منت کش دوا نہ ہوا      میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا  
آہ کو چاہیے اک عمر اتر ہونے تک      کون جیتا ہے تری زلف کے سر پہ تھمک  
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں  
دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

رو میں گئے ہم ہزار بار کوئی نہیں ستائے کیوں  
کسی کو دے کے دل کوئی تو اس بیچ فضاں کیوں ہو

نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو  
رہتے اب ایسی جگہ چکر جہاں کوئی نہ ہو  
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو  
کوئی اسید برہنیں آتی  
کوئی صورت نظر نہیں آتی  
نکتہ چیں ہے غم دل اسکو سنائے نہ بنے  
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے  
ابن مریم ہوا کمرے کوئی  
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

یہ امر کہ مندرجہ بالا اشعار باقی رہیں گے اس بات سے ثابت ہے کہ ابھی  
سے وہ لوگوں کی زبانون پر چڑھ گئے ہیں اور جو اشعار ضرب المثل کی طرح بولج  
پائے گئے ان کو گویا بقائے مدام حاصل ہو گئی، نہ صرف ان کے اشعار بلکہ اکثر  
ان کی تراکیب کو بھی جو انہوں نے خود اپنی قوتِ اختراع سے ایجاد کی تھیں مثلاً  
فردوس گوش، جنت نگاہ وغیرہ۔ رہی یہ بات کہ انہیں باتوں کو کوئی ان سے  
بہتر کہہ سکتا ہے یا نہیں یا غالب اس طرز کے خاتم ہو گئے اس کا کوئی



جواب نہیں دیا جاسکتا۔ اس لئے غالب کی بقائے دوام کے لئے صرف دو رکاوٹیں رہ گئیں، ایک تو موجودہ رجحان اور پروگنڈا جو غزل کے خلاف ہو رہا ہے دوسرا زبان کا مسئلہ۔ اول الذکر تو خیر ایسا نہیں کہ کامیاب ہو سکے اس لئے کہ غزل میں اس کی خاص سہولتیں اور خصوصیتیں ہیں۔ ان کی بنیاد پر اس کی ہر دلعزیزی کبھی کم نہ ہوگی، رہا زبان کا سوال تو یہ واقعی اہم مسئلہ ہے اور اس کے متعلق کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ ممکن ہے کہ آئندہ ہندوستان کی زبان ایسی نہ رہے جس میں فارسی اضافتیں یا عطف یا الفاظ اس قدر شدت و کثرت سے ہوں جیسی کہ دیوان غالب میں ہیں۔ اس لیے ہم بالکل یقین کیساتھ تو نہیں کہہ سکتے کہ غالب ہمیشہ ہمیشہ اسی شد و مد اور زور و شور کے ساتھ مقبول رہیں گے، ہاں اتنا البتہ کہا جاسکتا ہے کہ جب تک اردو زبان اور اس کے کچھنے والے قائم ہیں (اور جب تک غزل گوئی میں ان سے بڑھ کر کوئی شاعر پیدا نہیں ہوتا) غالب شاعر غالب رہیں گے ورنہ ایسے ان کی تاریخی حیثیت تو خیر بالکل مسلم ہے، غالب کی شاعری کا اردو نظم میں درجہ اور ان کا اثر و اثرات پر یہ چند ایسی حقیقتیں ہیں کہ غالب کو تاریخ ادب میں اعلیٰ جگہ دے بغیر نہیں سکتیں مناسب فارسی الفاظ کو فارسی ترکیب میں جڑنا، الفاظ کے مراتب پہچاننا، استعاروں اور تشبیہوں میں حسن اور معنی پیدا کرنا اختصار اور بلاغت سے زور کلام بہم پہنچانا سادگی میں پرکاری سمونا، فطرت انسانی کے رازوں کو بے تکان اور بڑی لاپرواہی سے آشکار کرنا یہ سب باتیں آنے والے شاعروں پر ضرور اپنا اثر کرتی رہیں گی۔ چنانچہ زمانہ موجودہ میں بھی اقبال، نائی، عزیز اور شائق کے کلام میں کچھ



فرق کے ساتھ اسی رنگ کی بھلک پانی جالی تہے اور آئندہ بھی نہ جانے کتنے، یہ  
 اسی طرح کے معنوی شاگرد پیدا کرے۔ مذاق سخن کا لفظی صنائع اور ظاہری خوبو  
 کی طرف سے معنوی خوبیوں اور خیال بندیوں کی طرف دھارا پھیر دینا اس اجتہاد  
 میں غالب کی حیثیت الگ مسلم ہے ایک اور امر جس کی وجہ سے ممکن ہے ان کی شہرت  
 آئندہ مزید بڑھے، موز فطرت انسانی ہیں جو ابھی حل نہیں ہوئے ہیں اور ممکن ہے علم نفسیات  
 کی ترقی کے ساتھ آئندہ واضح ہوں۔ مثلاً

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلاست

فرد در یا سبیل دروئے دریا آتش است

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے      یہ دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے  
 دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا      میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

— ❦ —



# اقبال کا نوجوان اور اس کی تعلیم



پہلی جنگ عظیم کے اختتام نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی طاقتوں اور اپنی اندرونی قوتوں کا دوبارہ جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آیا کہ وہ اس قابل ہیں بھی کہ موجودہ طوفان خیز موجوں میں اپنی کشتی کسی سمت یا کسی طرح کامیابی سے چلا سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا (اور اب بھی ہے)۔ سلطنت ترکی جس پر مسلمانوں کو خاص طور پر اور بجا طور پر تازہ ٹھکڑے ٹکڑے کر دی گئی تھی۔ ایران کی حالت الگ زبوں تھی اور وہ اپنی زندگی کے لیے روسی اور انگریزی قرضوں کا پابند تھا۔ عرب میں نا اتفاقی تھی، اور اس لیے بیشتر غیر اقوام کا شکار، کابل غریب تھا، ہندوستان غلام، چین بے بس، ایسی حالت میں یقیناً مسلمانوں کیلئے ظاہراً صرف ہی ایک صوت ہو سکتی تھی کہ ہر مسلمان ملک اپنے اپنے حدود میں محصور ہو کر اپنی بھلائی اور بہبودی کی ترکیبیں سوچنے لگے، لیکن ایک اس سے بھی بہتر صورت تھی وہ یہ کہ پہلے مسلمان خود غور کریں کہ وہ مذہبی، تعلیمی، معاشرتی اور تمدنی حیثیت سے دیگر اقوام کے مقابلے میں کیا درجہ رکھتے ہیں۔ کیونکہ اسی



سوال کا حل اس وسیع دنیا کی زمینوں میں ان کی زندگی کے لیے جگہ مقرر کر کے لگا دیں  
 وقت جو مسلمانوں کی حالت تھی وہ مختصر یہ کہ توہم پرست، گدازہ میں یقین رکھنے  
 والے، تقدیر پر پڑے رہنے والے، تدبیر و محنت سے جی چرانے والے، علم و  
 عمل کی دنیا سے دور بھاگنے والے۔ اسلام کی روح سے بے خبر۔ ظاہری باتوں اور فضول  
 کی روایات پر ایمان رکھنے والے، نتیجہ یہ ہوا کہ زمانہ نے انہیں بہت جلد دکھا دیا کہ  
 اب وہ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لائق نہیں رہے۔ ان کی تلواریں اب ننگ آلود  
 ہو گئیں تھیں۔ اتفاق ان سے اٹھ گیا تھا، ایمان ان سے جاتا رہا تھا ان کی تہذیب  
 پرانی ہو گئی تھی، اس لیے بہتر یہی تھا کہ اب اس دنیا میں وہ کوئی اپنا حق نہ سمجھیں  
 بلکہ ان لوگوں کے لیے جگہ چھوڑ دیں جو ان سے بہتر تھے، اور زندہ رہنے کے لیے ان  
 سے محنت و ترہ۔ یہ حالت و کیفیت تھی جس میں مسلمانوں نے اپنے آپ کو پاپا لکین اصلاح کی  
 کوشش کون کرتا۔ وہ جس کے دل میں درد ہوتا، یا وہ جس کے ہاتھ میں طاقت ہوتی  
 طاقت مصطفیٰ اکمال کے ہاتھ میں تھی اور درداقبال کے دل میں۔

چنانچہ جب مسلمانوں کی اس پستی کی طرف نظر پڑی تو اقبال ردائے بغیر نہ رہ  
 طاقت تو تھی نہیں کہ ایک دم زبردستی لوگوں کو صراط مستقیم پر لا ڈالتا۔ صرف درد  
 تھا جس کی بدولت اس نے مسلمانوں کے زوال پر پیچ و تاب کھایا اور انہیں جوش دلایا  
 کہ وہ اپنی اس گئی گزری ہوئی حالت کو سدھاریں، طرح طرح سے اکسایا کہ وہ قوت  
 عمل اور جدوجہد کے اصول کو سمجھیں اس پر عمل کریں تاکہ ترقی کر کے دوسری اقوام  
 کے دوش بدوش ہمارے چلنے لگیں بلکہ ان سے گونے سبقت لے جائیں۔ اور اس طرح  
 ان کی گزری ہوئی حالت پھر سدھر جائے اور ان کا روشن گزشتہ عہد دوبارہ عود



کرائے۔

علامہ پیام مشرق کے دیباچہ میں ایک جگہ رقمطراز ہیں "یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے۔ اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور ان کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ مشرق بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل خنید کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوام مشرق کو یہ غموس کر لینا چاہیے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ اور کوئی نئی دنیا خارجی وجہ اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اسکا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں مشکل نہ ہو۔ اس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی ریت کی تجدید یا تولید ہو قابل احترام ہے" غرض کہ علامہ نے قرآن کریم کے اس سادہ اصول کو ماننے ہوئے کہ لا یغیروا ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم (کوئی قوم نہیں بدلتی جب تک اس کے افراد کے دلوں میں تغیر نہ ہو)۔ مسلمانوں کی ذہنیت جو عرصہ سے سست ہو گئی تھی بدلنے کی کوشش کی لیکن یہاں ضرر ہم ان کے اس پیغام سے بحث کریں گے جو انہوں نے مسلمان نوجوانوں کو دیا "عرصہ سے مسلمان نوجوانوں کی حالت کیا ہے نظر غور بتاتی ہے کہ ہمارے تن آسانیوں کے ہم لوگوں کی اور کوئی غایت اور غرض نہیں ہوتی" لاپرواہیاں، مذہب سے نا آگہی، مذہب کے اصول سے بالکل بے خبری، مقصود حیات



محض ذاتی غفلت، فرنگی تعلیم اور مغربی فیشن سے محبت، خود اپنی حالت درست  
کرنے کی خواہش نہ رغبت

ترے صوفے میں افرنگی ترے قالین میں ایرانی  
لیونجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی  
امارت کیا شکوہ خسر دی بھی ہو تو کیا حاصل  
نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی  
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیب جاضر کی تحصیل میں

کہ پایا میں نے استغنائیں معراج سلمانی  
ظاہر ہے کہ استغنائے کیسے ہو جب دل میں نہ وسعت ہے نہ اطمینان اور  
اصلی جڑ تمام خرابیوں کی یہی دل کی بے سرو سامانی ہے جس کی تعمیر کی اقبال پوشش  
کرتا ہے۔ کیونکہ جب تک دل ٹھیک نہیں ہوتا خارجی معاملات بھی نادرست  
ہی رہیں گے۔ آپس میں نفاق، سڑی، غدارمی، نہ بکدوں میں رٹپ، نہ نگاہ  
نیں ذوق، قومیت سے بے گانہ اس لیے فرد بھی منتشر اور قوم بھی تباہ۔ دوسروں  
کے آگے دریوزہ گری۔ اپنی غلامانہ حالت کو باعث وقار سمجھنا یہاں تک کہ خود  
احساس غلامی کا مت جاتا۔ نتیجہ یہ کہ ظاہر محض نمائش اور دل محض تاریک۔ جس  
قوم کے نوجوانوں کا یہ حال ہو اس قوم کی بقا معلوم ہے فقط نیا م ہے تو زرنگار  
و بے شمشیر،

نوجوانان تشنہ لب، حنائی ایاغ  
کم نگاہ و بے یقین و ناامید  
شستہ رو، تاریک جاں، روشن دماغ  
چشم نشان اندر جہاں چیزے ندید



ناکس، منکر ز خود مومن یہ غیبر  
 موجودہ تعلیم سے اقبال نالاں ہیں اور بجا طور پر کہ نہ صرف اکاد پیدا کرتی ہے  
 بلکہ ہم کو بغیر کسی مقصد کے چھوڑ دیتی ہے اس کی نہ کوئی منزل ہے نہ مقصود۔ یہ صحیح ہے کہ  
 کہ دماغ کو ردشن کرتی ہے لیکن دل کو ماڑی ہے روح اور اس کی تمام اعلیٰ صفات  
 کو بے کار کر دیتی ہے نہ دل میں کوز رہتا ہے نہ روح میں تڑپ، ہم ادیت اور محض  
 شکم میں یقین رکھنے لگتے ہیں۔ روح کی اعلیٰ خوبیاں ہماری نگاہ سے دور ہو جاتی ہیں  
 اور یہی وجہ ہے کہ ہم کو اپنے میں یقین نہیں رہتا اور حجب اپنے میں یقین نہ رہا تو ظاہر ہے  
 کہ دوسروں کے محتاج ہو گئے۔ حضرت اقبال مسلمان نوجوانوں کی اسی زار حالت کی  
 شکایت پیغمبر صلعم سے یوں کرتے ہیں۔

ایں سلاں زادہ ردشن دماغ  
 در جوانی نرم و نازک چو حسریہ  
 ایں غلام ابن غلام ابن غلام  
 مکتب از دے جذبہ دیں درر بود  
 ایں ز خود بیگانہ ایں مست فرنگ  
 ناں خرید ایں فاقہ کش با جان پاک  
 دانہ چیں مانند مرغانِ سراسر  
 ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں۔

ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ  
 آرزو در سینہ او زود میر  
 حریت اندیشہ اور احرام  
 از وجودش ایں قدر دائم کہ بود  
 نان جوئی خواہد از دست فرنگ  
 داد مارا نالہ ہائے سوز ناک  
 از فضلے نیلوں نا آشناست

لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساق  
 کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحساد بھی ساق

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر  
 ہم سمجھتے تھے کہ لئے گی فراغت تسلیم



گھر میں پردیز کے شیریں تو ہونی جلوہ نما  
 لیکن آئی ہے مگر تیشہ فسراد بھی ساتھ  
 تخم دیگر بکھت آریم و بہ کاریم ز نو  
 کانچہ کشینم ز خجالت سوال کرد و رد  
 عصر حاضر کی تعلیم پر یوں تبصرہ کرتے ہیں  
 بختہ انکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی  
 مدرس عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر  
 اس زمانہ کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام  
 چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

جب پیر فلک نے ورق ایام کا اٹھا  
 آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز  
 پانی نہ ملازم ملت سے جو اس کو  
 پیدا ہیں نئی پود میں اکاد کے انداز  
 اقبال اس ناچتہ تعلیم اور اس سے اثر پذیری کی ذمہ داری محض نوجوانوں  
 ہی کے سر نہیں مقبول دیتے بلکہ اُن استاذہ سے بھی نکالیں ہیں جو خود نہ تعلیم کا مقصد  
 سمجھتے ہیں نہ اس علم میں غائر نظر رکھتے ہیں جس کا وہ درس دیتے ہیں۔

شیخ نکت کم سواد و کم لفظ  
 از مقام او نداد اور اخیر  
 آتش افزنگیاں بگداختش  
 یعنی اس دوزخ و گرگوں ساحتش  
 مومن و ازرمز مرگ آگاہ نیست  
 دروش لاغالب لا اللہ نیست  
 تادل او در میان سینہ مرد  
 می غنید رشید مگر از خواب و خود  
 از فرنگی می خسرو دلات و ثبات  
 مومن و اندیشہ او سومات  
 قہ ہا ذنی گوے و اور از ندہ کن  
 دروش اللہ ہو را زندہ کن  
 ماہمہ انوثتی تہذیب غرب  
 کشتہ افزنگیاں بے حجب ضرب  
 توازاں قوسے کر جام او شکست  
 و اتما یک نبی اللہ مست



نامسلمان باز بند خویش را از جہانے برگزیند خویش را

ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں۔

مکتب از مقصود خویش آگاہ نیست تا بجنب اندر و نش راہ نیست

نور فطرت را نہ جاننا پاک شست یک گل رعنا ز شاخ اوزرست

خشت را معمار با کج می بند خم سے بٹا با کجہ شاہیں دہم جا بیکدہ

غرض کہ اس تعلیم نے جس نے مسلمان نوجوانوں کی دماغی ذہنیت اور روحانی

فطرت کو یوں بدل دیا ہو اسے اقبال کس طرح پسند کر سکتے تھے۔

من آں علم و فراست با پر کاہنمی گیرم کو از تیغ و سپر بیکانہ ساز و مرغاری

اسی لئے اقبال چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلم نوجوانوں کی ذہنیات میں انقلاب

پیدا ہو جائے تاکہ ان نوجوانوں کو اپنی رفعت کی حد اپنی حیات کا مقصد اور اپنی

روحانی طاقتوں کا احساس ہو سکے۔

اے مسلمانانِ فغاں از فتنہ ہائے علم و فن

اہرمن اندر جہاں ار زائل یزدداں دیر یاب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

فاغظ اندر مسجد و فرزند اور در مدر

آں بہ پیری کو دگے ایں پیر در عمد شباب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب



لیکن وہ ایسا انقلاب محض ظاہری، نہائشی یا وقتی نہیں چاہتے بلکہ دل کا اور  
روح کا انقلاب چاہتے ہیں۔ اور یوں بھی انقلاب کی توفیق اُسی وقت صحیح ہو سکتی  
ہے جب ایک دوسرا لاکھ عمل پیش نظر ہو جائے۔ یہ دل و نظر کا انقلاب اقبال  
کے خیال میں صحیح مذہبی تعلیم میں پنہاں ہے کیونکہ اسی سے دل و نظر کی تعلیم  
یعنی اخلاق کی تعمیر ہو سکتی ہے موجودہ تعلیم کو بظاہر نہایت اعلیٰ تھی لیکن جب  
تک اس سے ذہنی و فکری بلندی نہ نصیب ہو اس وقت تک تعلیم کا مقصد  
حل نہیں ہو سکتا۔

مرید ہندی :- چشم بنیاد سے ہے جاری جوئے غوں

علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

علم را بر تن زنی بارے بود

علم را بر دل زنی یا رے بود

پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب

روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

دست ہرنا اہل بیمار ت کند

سوئے مادر آ کر بیمار ت کند

علم و حکمت کالے کیونکر سرخ

کس طرح ہاتھ آئے سوز درد و داغ

علم و حکمت زاید از نان حلال

خشق و رقت آید از نان حلال

پیر دومی :-

مرید ہندی :-

پیر دومی :-

مرید ہندی :-

پیر دومی :-



مسلمان نوجوانوں اور ان کی تعلیم کا صحیح اندازہ کیا ہے۔

عقل ہلے باک دہلے گداز  
علم و فن دین و سیاست عقل و دل  
آسیا آں مرزد بوم آفتاب  
قلب اوبے واردات نو بنو  
روزگار شش اندرین دیر نیر  
صید ملایاں و نچیر ملوک  
عقل و دین و دانش و ناموس و ننگ  
یاد و سری جگہ

در مسلمانان محو آں ذوق و شوق  
عالماں از علم تر آں بے نیاز  
گرچہ اندر خانقاہاں ہائے ہوس  
ہم مسلمانان انہرنگی تاب  
بے خبر از سر دیں اندامینہ  
خیر و خوبی بر خواص آمد سرام  
اہل دیں را باز داں از اہل کیں  
کر گساں را رسم و آیین دیگر است  
غرض کہ اس اہل کلیسا کے نظام تعلیم کو دین اخلاق کے خلاف ایک سازش  
سمجھتے ہوئے پہلے طالب علم کی اندرونی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

آں یقین آں رنگ و بو آں ذوق و شوق  
صوفیاں در زندہ گرگ و مو دراز  
کو جواں مردے کہ صہبا در کد دست  
چشمہ کوثر بجویند از سراب  
اہل کیں اند اہل کیں اند این ہر  
دیدہ ام صدق و صفا را در عوام  
ہم نشین حق بجو یا اد نشین  
سلطت پر واز شاہیں دیگر است  
غرض کہ اس اہل کلیسا کے نظام تعلیم کو دین اخلاق کے خلاف ایک سازش



شاخ گل پر چمک دلیکن      کر اپنی خودی میں آشیانہ  
 وہ بھر ہے آدمی کہ جس کا      ہر قطرہ ہے بحر بکرا نہ  
 غافل منشین نہ وقت بازی آ      وقت ہنراست و کار سازی

اور یہ کہ

منظر وہ طلب کر کہ تری آنکھ نہ ہو سیر      سینے میں ہے راز طو کا نہ تو بہتر  
 کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر      تعلیم کے تیزاب میں ڈال اپنی خودی کو  
 ہو جائے ملائم تو جد ہر حل ہے اُدھر پھر      تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب  
 سونے کا ہالہ ہو تو مٹی کا ہے اک دھیر      یا یہ کہ

سینے میں اگر چہ ہو دل گرم      رہ جاتی ہے زندگی میں خامی  
 پتھر اگر ہو زیرک و چست      آتی نہیں کام کہنہ دای  
 ہے اب حیات اسی جہاں ہیں      شرط اس کے لیے پرشہ کامی  
 غیرت ہے طریقہ حقیقی      غیرت سے ہے فقر کی تہامی

اقبال کے نزدیک خودی کی تربیت پہلا زینہ ہے جس پر کسی نوجوان کو قدم  
 رکھنا ہے جو کوئی اس بنیادی اصول سے ناواقف ہے اس کی تربیت غیر مکمل اور  
 اس لیے اُس کی زندگی بے کار و بے مصرف۔ خودی کی پرورش صحیح تربیت پر موقوف  
 ہے تاکہ مشت خاک میں آتش ہمہ سوز پیدا ہو سکے۔

یہی ہے سر کلیمی ہر اک زمانہ میں      ہوئے دشت و شیبہ ثباتی و دھوز  
 وہ ہندی مکتبوں سے ناامید ہیں کہ محکوم اپنے حق میں موسیقی دصور تگری د



و علم نباتات ہی کی تحصیل اچھی تعلیم سمجھتا ہے، ساتھ ہی شیخ کتب کے طریقوں سے بھی  
 کسی طرح کی امید نہیں رکھتے کہ وہ کشاد دل نہیں رکھتے پھر بھی طالب علموں سے  
 ہمدی رکھتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ  
 خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کرے  
 کہ تیرے بھر کی موجوں میں اضطراب نہیں  
 کیونکہ

دل رزتا ہے حرفانہ کشاکش سے ترا  
 اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا  
 فیض فطرت نے تجھے دیدہ شاہیں بخشا  
 مد سے نے تری آنکھوں کو چھپایا جن کو  
 زندگی موت ہے مٹھو دیتی ہے جب ذوق خراش  
 جو یہ کہتا تھا خود سے کہ بیانیہ تراش  
 جسمیں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش  
 خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار میں فاش  
 اور یہ ذوق خراش کتابوں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ نظر سے۔ یہ فیضان نظر  
 ہی کی دولت تھی جس نے ابراہیم کو آداب فرزندہ سکھائے تھے۔

صد کتاب آموزی از اہل شہر  
 ہر کسے زان مے کہ ریزد از نظر  
 از دم باد کھر میر و حیراغ  
 کم خور و کم خواب و کم گفتار باش  
 شیوہ اخلاص را محکم بہ گیر  
 عدل در قہر رضا از کف مدہ  
 حکم دشوار است و تاویلے مجو  
 حفظ جاننا ذکر و منکر بے حساب  
 خوشتر آن درے کہ گیری از نظر  
 مست می گردد و باند از دگر  
 لالہ زان باد کھرے در ایام  
 گرد خود گردندہ چوں پر کار باش  
 پاک شوا از خوف سلطان و امیر  
 قصد در فقر و غنا از کف مدہ  
 جز بقلب خویش قندیلے مجو  
 حفظ تن با ضبط نفس اندر شباب



حاکمی در عالم بالا دست  
لذت سیر است مقصود سفر  
جز بحفظ جان و تن ناید بدست  
گزنگ بر آشیاں داری پر  
سیر آدم را مقام آدم حرام  
آشیاں با فطرت او ساز نیست  
رزق ز باغ و کرکس اندر خاک گور  
رزق بازاں در سوادِ ماه و ہور

یعنی نوجوانانِ ملت آپس میں محبت پیدا کریں۔ قہر و غضب کی حالت میں بھی  
عدل کو ہاتھ سے نہ دیں، اطمینان و بے فکری و عیش میں بھی دیدہ دل دار نہیں  
ضمیر کو پاک اور دل کو بلند اور وسیع بنائیں۔ جوانی میں نفس کو قابو میں رکھنے کی کوشش  
کریں اور آخر یہ کہ پرواز سے کبھی غافل نہ رہیں۔ اس لیے کہ توکل اور استغنا  
جہود کے ہم معنی ہیں۔ ایک زندگی یوں بھی ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے کہ در یوزہ گری  
کی جائے یعنی دوسروں کی محنتوں پر کتوں کی طرح جیا جائے ایک زندگی یہ ہے کہ شاہین  
و باز کی طرح اپنی زندگی کے لیے خود جد و جہد کی جائے اور ہر روز اپنے اوپر خود  
اپنے رزق کے لیے اعتبار کیا جائے۔

علم بخیر سوز دل کے بالکل بے کار ہے اگر دل کی تربیت نہ ہوئی اور علم اس کو  
نہ سنوار سکے، اس کی تربیت نہ کر سکے تو کرم کتابی کی طرح ابوسینا و فارابی کی رُق  
گردانی سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ علم اگر زندگی کو نہ بناسکے تو ایسے علم سے کیا  
حاصل؟ اور علم زندگی کو اسی وقت بنا سکتا ہے جب دل میں سوز و عشق پیدا  
ہو جائے ورنہ یوں کتاب میں تو اتنا کور ذوق بنا دیتی ہیں کہ صبا سے بولے گل کا بھی  
سراغ نہیں مل پاتا۔



نکو گفت پروانه نسیم سوزے کہ این نکتہ را در کتابے نیابی

تپش می کند زندہ تر زندگی را

تپش می دہد بال و پر زندگی را

پھر آگے تعلقین یہ ہے کہ ایک نوجوان میں ادب و آدمیت ہونا چاہیے  
انسانیت کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کے ساتھ خواہ وہ کافر ہو یا مومن برابر کی شفقت  
کرنا چاہیے۔ بری صحبتوں سے بچنا چاہیے کہ مرد کا ستر ہی ہے۔

دین دراصل کیلئے محض طلب و ذوق و شوق میں جلنا، اور یہ طلب  
ادب و احترام سے پیدا ہوتی ہے جس کا انجام عشق ہوتا ہے مگر اور ادب و احترام  
کا نوجوان میں پیدا ہونا اس کی اندرونی اصلاح کے لیے پہلا اور ضروری سبق  
ہے۔

دیں سراپا سوختن اندر طلب	انہماش عشق و آوازش ادب
آبرئے گل زرنگ دلئے اوست	بے ادب بے رنگ لب بے آبروست
نوجوانے راجہ بنم بے ادب	روزمن تاریکی می گرد و چو شب
تاب تب در سینہ افزا ید مرا	یاد عہد مصطفیٰ آید مرا
از زمان خود پشیمان می شوم	در قرون رفتہ پنہاں می شوم
ستر زن یا زوج یا خاک لحد	ستر مرداں حفظ خویش از یار بد
حرف بد را بر لب آوردن خطاست	کافر و مومن ہمہ خلق خدا است
آدمیت احترام آدمی	با خیر شو از مقام آدمی
آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن	بر طریق دوستی گامے بدن



نبدہ عشق از خدا گیر و طریق می شود بر کافر و مومن شفیق  
کفر و دین را گیر در پنهانے دل دل اگر بگریزد از دل، قوائے دل

یا

ہوئی نہ ز داغ میں پیدا بلند پروازی خراب کر گئی شاہیں بچے کو صحبت داغ  
حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی خدا کرے کہ جوانی تری ہے بے داغ  
تیسرا سبق وہ نوجوانوں کو یہ دیتے ہیں کہ خواہ تو کہیں کا بادشاہ کیوں نہ ہو  
لیکن فقر کو ہاتھ سے نہ دینا۔ فقر کے معنی یہ ہیں کہ دنیا سے دل کو الگ رکھنا۔  
باسمہ و بے ہمہ رہنا۔ دنیا کی کسی شے سے محبت نہ رکھنا۔ دنیا میں کسی چیز کی طلب  
نہ رکھنا سوائے درد و سوز دل کے، نعمتوں کی کثرت اور فراوانی، اسباب تعیش  
انسان کو اندھا بنا دیتی ہے اس کے دل میں سوز نہیں رہتا۔ وہ علائق دنیوی میں  
اس قدر پھنس جاتا ہے کہ پھر اس کو اپنی رنج کی پرورش کی فکر نہیں رہتی۔ حق بات  
نہ وہ کہنا چاہتا ہے نہ سننا۔ صداقت سے وہ دور رہنے لگتا ہے، جب یہ حالت  
ہو جاتی ہے تو پھر دکھ، مصیبتیں اور تکالیف روحانی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے  
اقبال نوجوانوں کو آگاہ کرتا ہے کہ ہم خواہ کتنے اعلیٰ مراتب دنیوی پر کیوں نہ پہنچ  
جائیں لیکن دل درویش رہنا چاہیے۔ آدمی وہی ہے جو دولت حاصل کر سکے نہیں  
پر مست نہ ہو جائے جو ضمیر پاک و نگاہ بلند و متی شوق رکھے نہ کہ مال و دولت  
قارون و فکر افلاطون۔

گرچہ باشی از خدا دندان دہ فقر را از کف مدہ از کف مدہ  
در جہاں جہز درد دل سامان مخواه نعمت از حق خواہ داز سلطان مخواه



اے بسا مرد حق اندیش و بصیر      می شود از کثرت نعمت ضریر  
 کثرت نعمت گداز دل بزد      ناز می آرد نیاز دل بزد  
 من فدائے آں که درویشانه زیست      دوائے آں کو از خدایے گانه زیست  
 اس کے ساتھ ہی اس بات کی صلاح بھی ہے کہ یہ زمانہ ایسا آگاہ ہے  
 جس میں لوگ جسم کو جان پر فوقیت دیتے ہیں اور جسم کی خبر گیری کرتے ہیں جان کی  
 نہیں اس لئے مسلمان نوجوان کو یہ بھی چاہیے کہ کسی ایسے مرد حق کی پیروی کرے  
 جو اس کے زمانہ میں ہو کیونکہ ایسا شخص

ادل اندر نار خود سوز و ترا      باز سلطان بیاموز و ترا  
 ماہمہ با سوز او صاحب دلم      در نہ نقش باطل آب و گلیم  
 اور ایسا شخص اپنے اپنے زمانہ میں کبھی کلیم کہلاتا ہے کبھی مسیح، کبھی خلیل، اور کبھی  
 لیکن اگر ایسا شخص تجھ کو نہ مل سکے یا کسی ایسے ہی مرد حق کی باتوں سے تو واقف  
 نہ ہو سکے تو پھر گزرے ہوؤں میں سے کسی ایسے کو اپنا راہبر بنا جو تیری رُح  
 کو رقص میں لے آئے تاکہ تجھ میں سوز، تپش، ہمدردی، اور ذوق و شوق  
 پیدا ہو سکے۔

ترسم ایں عصرے کہ تو زادی راں      در بدن غرق است و کم داند زہ جاں  
 گریہا بی صحبت مرد خبیر      ازاب و جدا خیم من دارم بکیر  
 پرورد می را رفیق راہ ساز      تا خدا بخشد ترا سوز و گداز  
 زانکہ رومی مغز را داند ز پوست      پائے او محکم فتد در کوئے دوست  
 رقص تن از حرف ادا مویختند      چشم را از رقص بجاں آموختند



رقص تن در گردش آرد خاک را  
 رقص جاں آموختن کارے بود  
 تاز نار حرص و غم سوزد جگر  
 ضعف ایماں است و بگیری است غم  
 می شناسی! حرص فقر حاضر است  
 اے مرا تسکین جان نا شکیب  
 ظاہر ہے جب جان رقص میں آجائے گی اور اُس میں سوز و گداز پیدا  
 ہو جائے گا تو ایسی زندگی دین کی زندگی ہوگی، ایسی زندگی مضبوط زندگی ہوگی  
 اور اب اگر وہ لا الہ کے گا تو زمین و آسمان گردش میں آجائیں گے درختوں  
 خالی ہونٹوں سے کہہ دینا محض ایک ذرا سی محدود ہو کہ حرکت دیدینا ہے۔  
 در رہ دین سخت چوں الماس زری  
 دل بحق بر بند دے و سو اس زری  
 سر دین صدق مقال، اکلِ حلال  
 خلوت و جلوت تما شائے جمال!  
 لا الہ گوی؟ بگو از دے جاں  
 تاز اندام تو آید بویے جاں  
 ہر دمہ گرد و دز سوز کا لہ  
 دیدہ ام ایس سوز را در کوہ د کہ  
 ایں و وحوت لا الہ گفتار نیست  
 لا الہ جز تیغ بے زہار نیست  
 ز نیستن با سوز اد قہاری است  
 لا الہ ضرب است و ضرب کاری است  
 ظاہر ہے اقبال کا ایسا نوجوان کس قدر با محبت، کس قدر بلند ہمت  
 کس قدر سخت کوشش اور زندگی کی جدوجہد کے لیے کس قدر پامرد با امید  
 اور تیار نظر آئے گا۔ اس کے علاوہ ایسا جوان آزاد ہو گا غلام نہیں۔



عقابی رُوح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں  
 نظر آتی ہے اُس کو اپنی منزل آسمانوں میں  
 نہ ہو تو میدا، تو میدی ز دالیِ علم و عرفاں ہے  
 امید مر و مومن ہے خدا کے راز دانوں میں

نہیں تیرا نشمین قصرِ سلطانی کے گنبد پر  
 تو شاہیں ہے نسیرا کہ پاڑوں کی چٹانوں میں

اپنے بیٹے جاوید اقبال کو ایک خط میں یوں نصیحت کرتے ہیں۔  
 دیا ر عشق میں اپنا مہتام پیدا کر  
 خدا اگر دل فطرت شناس ہے تجھ کو  
 نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر  
 اٹھانہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں  
 سکوت لالہ دگل سے کلام پیدا کر  
 سفال مہد سے مینا و جام پیدا کر  
 مرا طرلق امیری نہیں فیری ہے  
 خودی نہ 'زیچ'، غریبی میں نام پیدا کر

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے  
 ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کسند

اشرار کے تیرے جوانوں کو سلامت  
 دے ان کو سبق خود شکنی خود نگری کا  
 ضربِ کلیم میں محرابِ گل افغاں کے انکار میں اپنا مثالی نو جوان یوں پیش

کرتے ہیں۔  
 وہی جواں ہے قیدی کی آنکھ کا تارا  
 شباب جس کلہے بے داغ ضربِ کاری  
 اگر ہو جنگ تو شیرانِ غائب سے بڑھکر  
 اگر ہو صلح تو رعنا غنزال تاتاری



عجب نہیں ہے اگر اسکا سوز ہی ہمہ سوز  
 خدا نے اُس کو دیا ہے شکوہ سلطانی  
 کہ نیتاں کیلئے بس ہے ایک چنگاری  
 کہ اس کے فقر میں ہر حیدری دگراری  
 نگاہ کم سے نہ دیکھ اس کی بے کلاہی کو  
 یہ بے کلاہی ہے سرمایہ کلمہ داری  
 یہی نہیں بلکہ خدا سے بھی دعا کرتے ہیں۔

جگر سے وہی تیر پھر پار کر  
 تیرے آسمانوں کی تاروں کی خیر  
 متنا کو سینوں میں بیدار کر  
 زمینوں کے شبے ندہ داروں کی خیر  
 جو انوں کو سوز جگر بخش دے  
 مرا عشق، میری نظر بخش دے  
 اقبال کے نزدیک وہ جوان ہنگامہ پیکار کے لائق نہیں جو نالہ مرغان بحر  
 سے مدد و مش ہو جائے عیش اور اطمینان تو جو انوں کے لیے جود اور موت ہے  
 طلباء علی گڑھ کالج کو متوجہ کرتے ہیں۔

آئی تھی کوہ سے صد اراز حیات ہے سکوں  
 کتنا فقہا مور تا تو اں لطف خرام اور ہے  
 جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا  
 اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے  
 موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو  
 گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے  
 شمع سحر یہ کہہ گئی سوز ہے زندگی کا ساز  
 غم کدہ نمود میں شرط دوام اور ہے  
 سرسید کو بھی سمجھاتے ہیں۔



مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں      ترک دنیا قوم کو اپنی نہ سکھانا کہیں  
 دانہ کرنا فرقہ بندی کیلئے اپنی زباں      چھپ کے ہے بیٹھا ہوا نگامہ محشر ہاں  
 موجود گردہ اساتذہ کو وہ اس قابل نہیں سمجھتے کہ جو انوں کی تعلیم ان کے  
 سپرد کی جائے کیونکہ وہ خود بھٹکے ہوئے ہیں انھیں خود راہ کی خبر نہیں ہے  
 اور جب خود انھیں خبر نہ ہوگی تو وہ کسی دوسرے کو راستہ کیونکر بتا سکیں گے  
 پیش خورشید بر ملکش دیوار      خواہی اور عین خانہ نوزانی

شیخ مکتبہ بال جبریل

یا

مقصد ہو اگر تربیت عمل بدخشاں      بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پر تو  
 دنیا ہے روایات کے پردوں میں گرفتار      کیا مدرسہ کیا مدرسہ والوں کی تلک و دو  
 کر سکتے تھے جو اپنے زمانہ کی امامت      وہ کہنے دماغ اپنے زمانہ کے ہیں پرو  
 فلسفہ کو وہ نوجوانوں کے لیے مفید نہیں سمجھتے اس لئے کہ فلسفہ حرکت کو فنا  
 کرتا ہے اور بے حرکتی موت ہے۔

انجام خود ہے بے حضوری      ہے فلسفہ زندگی سے دوری  
 افکار کے نغمہ ہائے بے صوت      ہیں ذوق عمل کے واسطے موت  
 دیں مسلک زندگی کی تقویم      دیں سیر محمد براہیم  
 دل در سخن محمدی بند      اے پور علی زبوں علی چند؟  
 نہ صرف شعر و شاعری ہی میں علامہ اقبال نوجوانوں کی تعمیر سیرت پر زور دیتے  
 تھے، بلکہ وہ زبان بھی اسی قسم کی تلفیق کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ لاہور کے چند  
 نوجوان طلباء علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک جلسہ مشاعرہ کی



صدارت کے لئے درخواست کی۔ علامہ نے فرمایا خیر میں صدارت تو کرتا نہیں،  
 لیکن شاعری تم لوگوں کے لئے بہت مضر ہے اور پھر اس کے بعد موجو وہ شاعری  
 اور اس کے بے فائدہ ہونے پر ایسا کچر دیا کہ ان نوجوانوں کا تمام جذبہ شاعری  
 یک نخت ٹھنڈا ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ نوجوانوں کی جو حالت عرصہ تک رہی ہے یعنی یورپ کی کورانہ  
 تقلید۔ احساس غلامی غائب، خود پر بھروسہ نہ ہونا، تعلیم کو محض ذریعہ معاش یا  
 ذریعہ وجاہت سمجھنا کالج میں بیٹھ کر خالی ڈنگیں مارنا۔ ظاہر کو اصل حقیقت  
 جاننا۔ خود غرضی اور اس لئے آپس میں نفاق۔ ظاہری اور حوالی چیزوں  
 پر یقین رکھنا اس لئے بیدینی لاندہی، تن کی پرورش اور روح کی تربیت  
 سے نا آشنا محض ہونا ظاہر ہے کہ جس قوم کے افراد کا یہ سطح نظر ہو گا اس قوم  
 کی بقا کیونکر ہو سکتی ہے۔ اب جبکہ قومیں زندگی کی دوڑ میں مصروف ہیں اور  
 عرصہ کائنات میں فنا و بقا کا سخت معرکہ گرم ہے جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دیے  
 یا جو نرم بستر کا جو یا ہوا یقینی اس کو دوسری قوم میں کھلتی ہوئی اور رونڈتی ہوئی  
 آگے نکل جائیں گی۔ کیا مسلمان قوم اس قابل ہے کیا اس میں زندگی کی اس قدر  
 قوت ہے کہ وہ موجودہ تنازعہ البقا کی گرما گرمیوں کی تاب لاسکے؟ جو اب اثبات  
 میں کیونکر دیا جاسکتا ہے اس لئے کہ اب وہ مسلمان مسلمان ہی نہیں رہا، اب  
 مسلمان اور مسلمان بچے جیسے رہ گئے ہیں اُن کی صورت اُن کی حالت یہ ہے

مومن و بیش کساں بستن نفاق      مومن و غداری و فقر و نفاق  
 بالپیشے دین دلت ز فرخت      ہم متاع خانہ و ہم خانہ سوخت



لا الہ اندر نمازش بود و نیست  
 ناز با اندر نیازش بود و نیست  
 زور در صوم و صلوٰۃ او نہا  
 جلوۃ در کائنات او نہا  
 آنکہ بود اقتدار ساز و برگ  
 فتنہ او حسب مال ترس مرگ  
 رفت از دواںستی و ذوق و سرور  
 دین او اندر کتاب د او بہ گور  
 صحبتش از عصر حاضر در گرفت  
 حرف دین را از د و پیغمبر گرفت  
 آن دایراں بود و او آن نہدی نتراد  
 آن زج بیگانہ و این از جہاد  
 تا جہاد و حج نہاں از واجبات  
 رفت جان از پیکر صوم و صلوٰۃ  
 سینہ با از گرمی تر آن تہی  
 از جنس مرداں چہ امید ہی

از خودی مرد مسلمان در گذشت

لے خضر دستے کہ آب از سر گذشت

سجدہ گزوست زیں لرزیدہ است  
 بر مرادش مروتہ گردیدہ است  
 سنگ اگر گیرد نشان آن سجود  
 در ہوا آشفتمہ گرد و ہم چودود  
 این ماں از سر نیزیری ہسچ نیست  
 اندر وجہ ضعف پیری ہسچ نیست  
 آن شکوہ ربی علا کجا ست  
 ای گناہ ادست ہا تقصیر است  
 ہر کے بر جادہ او تنہا  
 ناقہ مایے زمام د ہرزہ نو

صاحب قرآن دے ذوق طلب

العجب ثم العجب ثم العجب

(جاوید نامہ)

اپنے گزشتہ سے ہم سبق نہیں لیتے۔ حال کی کیفیتوں اور زار حالوں کو



دیکھتے ہیں لیکن آنکھیں بند کر لیتے ہیں، آئندہ کے ہولناک نتائج رہ رہ کر اپنا بھیاں  
 چہرہ ہم کو دکھلاتے ہیں لیکن ہم ہیں کہ بے فکر اور لا پرواہ بیٹھے ہیں، ہم کو اپنے میں  
 اعتبار نہیں رہا۔ خود میں زور اعتماد نہیں رہا۔ فنا و دیدانت اور پود و مرد و مہب  
 والی، کو ہم بقا سمجھنے لگے ہیں اور اپنی کشتی موجوں کے تلاطم میں بغیر کسی تہوار یا ناخدا  
 کے ڈال رکھی ہے، ہم خود قرآن کو پس پشت ڈال دینے کی وجہ سے اپنا  
 راستہ تاریکیوں میں بھلا بیٹھے ہیں ایسے حالات میں اقبال کی آواز پر لبیک نہ  
 کہنا گویا موت و ذلت کو یقینی دعوت دینا ہے اقبال کی بانگ کہ اپنی خودی  
 میں یقین رکھو، ناامیدی مہول جاؤ۔ دل میں درد اور تپش پیدا کرو۔ دل کو بلند  
 اور روح کو سر بلند کرو۔ فقر کو جادہ راہ بقا سمجھو۔ راہ حق اور راہ دین میں کام  
 ہو۔ یہ ایسی بانگ دراہے کہ سونے والوں کو بغیر چونکے نہیں رہ سکتی اور مست  
 اور نیند کے متوالوں کو ایسا ہلا دے گی، ایسا جھنجھوڑے گی کہ وہ لا محالہ آنکھیں  
 کھولنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

لیکن ایک سوال یہاں پر پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کا یہ نوجوان علمی یا محض  
 خیالی۔ یعنی یہ کہ وہ نوجوان جو اقبال کے دل و دماغ میں ہے کیا دنیا میں واقعی  
 طور پر ایسا ہونا اور ایسا تربیت اور تعلیم سے بن جانا ممکن ہے؟ بجا طور پر اعتراض  
 ہو سکتا ہے کہ جوانی جس میں شباب فطرتاً جویش اور نمائش خودی پر بہت مایل ہوتا  
 ہے کیا اقبال کے فقر کی تلقین دل پر رکھ سکتا ہے۔ اور اس پر عمل پیرا ہو سکتا ہے؟  
 کیا وہ دنیا اور علائن دنیا سے اپنے دل کو الگ کر سکتا ہے جبکہ ہر قدم پر اس  
 کے لیے لغزش کے سامان موجود رہتے ہیں کیا وہ اس دنیا سے جس کو بہت نیچرین



دیکھتا اور سمجھتا ہے یوں دل برداشتہ ہو سکتا ہے کہ اس میں بھی رہے اور اس سے  
الگ بھی رہے باہمہ اور بے ہمہ کا اصول اہل شباب کے لیے ناممکن ہی معلوم  
ہوتا ہے۔ دل میں فقر پیدا کرنا۔ جوانی میں اپنے دل کو بوڑھا بنالینا ایک باغی  
بیاری کھی جاسکتی ہے نہ کہ اس کا صحیح استعمال۔

اقبال کے پیغام فقر کی غلط تشریح ہوگی اگر اُس سے اس قسم کے شکوک  
پیدا ہوں۔ اقبال کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ نوجوان اپنے احساسات یا جذبات  
یا خیالات میں کسی طور پر بوڑھا ہو جائے۔ بلکہ وہ تو ایک ابدی شباب جو شاد  
ذوق عمل کی تلقین کرتا ہے یہ صحیح ہے کہ زمانہ شباب تمام دکھیں زکینیاں اور بچپیاں  
اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور اپنے باہر کی دنیا بھی زکین زکین دیکھتا ہے لیکن  
وہ یہ تو نہیں کہتا کہ اس زکینی تخیل کو ختم کر دو۔ اقبال برہم چوں کی طرح نفس کو  
فنا کرنے کی ترغیب نہیں دیتا۔ کیونکہ وہ اس کے سخت خلاف ہے (ملاحظہ ہو واقعہ  
برہم چاری چند گھنٹے علامہ اقبال کے ساتھ "معارف ستمبر ۱۹۳۸ء) بلکہ وہ یہ بتاتا ہے  
کہ یہ ثانوی چیز ہے اولیٰ شے حق کی راہ میں جدوجہد اور اپنی خودی کی تعمیر ہے  
اور اپنے کردار و سیرت کی تربیت۔

مصاف زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر

شبتان محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

لیکن شبتان محبت میں حریر و پرنیاں ہونے سے پیشتر مصاف زندگی

میں سیرت فولاد پیدا کرنا شرط اول ہے اس کے علاوہ اقبال کا نوجوان خیالی  
نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ اول تو اقبال کی تلقین جدوجہد جو شاد و سرگرمی کیلئے



عین فطرت شباب کے مطابق ہے اس کے علاوہ طبیعت میں استغناء و ہمت پامردی  
 اور خود اعتمادی کا پیدا کرنا بھی جوانی کی نفسیات سے بالکل مناسب ٹھہرے گا،  
 اس لیے کہ جوانی ہی میں آدمی اپنے میں زور و سوز محسوس کرتا ہے۔ جوانی ہی میں  
 وہ ہر چیز فتح کر سنے اور ہر شے پر قدرت حاصل کرنے کا طامع ہوتا ہے اور  
 جوانی ہی میں اپنی محنت و کوشش کے اعتماد پر اپنے میں آسانی سے شان استغناء  
 پیدا کر سکتا ہے۔ بڑھاپا نصیحت قوی کا زمانہ ہے اور کمزوری کی وجہ سے حرص  
 دنیا اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ اپنے میں وہ شان بے نیازی نہیں پیدا کر سکتا  
 جتنا کہ ایک نوجوان اپنے دل میں پیدا کر سکتا ہے اور اسی شان بے نیازی کا دوسرا  
 نام فقر ہے اپنے نظریہ فقر کی اقبال مزید تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ رہے فقر	جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا	اشر کی شان بے نیازی
کنجشک و حمام کے لئے موت	ہے اس کا مقام شاہ بازی
روشن اس کے خرد کی آنکھیں	بے سرمہ بول علی و رازی
حاصل اس کا شکوہ محمود	فطرت میں اگر نہ ہو ایازی
تیری دنیا کا یہ سرائیل	رہتا نہیں ذرق نے نوازی
بے اس کی نگاہ عالم آشوب	در پردہ تمام کا رسازی
یہ فقر غیور جس نے پایا	بے تیغ دستان ہے مرد خاوی

مومن کی اسی میں ہے امیری

اشر سے انگ یہ فقیری (عبد اللہ - ضرب کھیم)



اقبال کا پیام عمل اور اقبال کی اصلاح جہد و جہد نوجوانوں کے خون کو گرم کرتی ہے اور چونکہ گرمی شباب کا تقاضا ہے اس لیے کسی طور پر نہیں کہا سکتا کہ اقبال کا پیغام جہاد نوجوانوں کی فطرت کے مطابق نہیں ہے یہی وہ باتیں جن کی تربیت کی اقبال نے تاکید کی ہے وہ ان میں پہلے سے موجود ہوتی ہیں اس لیے ذرا سی تربیت سے ان خصائص کو غیر معمولی طور پر ترقی دی جاسکتا ہے مثلاً کون جوان ایسا ہوتا ہے جس کے دل میں جو صلہ مندی عزم و ہمت کے جذبات نہیں ہوتے۔ اسی جذبہ جو صلہ مندی کو اقبال اور بھی اکسانا چاہتے ہیں اس قدر کہ اس کو زمین و آسمان کا مالک بنا دیتے چاہتے ہیں بلکہ ذوق طلب اس قدر بلند دیکھنا چاہتے ہیں کہ کسی مقام پر رک جانا یا کسی خاص جگہ کو منزل قرار دے دینا وہ نوجوان کے ذوق لشکر کی اور جو صلہ کی پستی قرار دیتے ہیں۔

تو رہ نور و شوق ہے؟ منزل نہ کر قبول  
 لے جوئے آب بڑھ کے ہو دریا تند و تیز  
 لینی بھی ہمیشہ ہو تو محمل نہ کر قبول  
 ساحل بچھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول  
 ظاہر ہے نوجوانوں کو اس قسم کی تلقین ان کی فطرت کے کس قدر مطابق ہے اور کیوں نہ ہو سکتی ہے؟

اقبال کے اس نوجوان کے متعلق ایک دوسرا سوال یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا وہ شعائر و روایات اسلامی کے مطابق ہے؟ صوفیاء و کرام تو اس سے قبل ذات کو فنا کر دینے کی تعلیم دیا کرتے تھے، اور قرآن سے اس کی تادیبیں بھی پیش کرتے تھے جبر کو اصول زندگی مانتے تھے، اور خود کو مٹا کر خدا پر تکیہ کرنا شرائط ایمان میں سے سمجھتے تھے۔ یہ آخر اقبال نے کیوں اور کیسے خود کی



بقا اور خودی کی قدرت کے اصول قرآن سے استنباط کر لئے۔

درحقیقت ایران کا تصور یعنی خودی کے بطلان کا اصول دیدانت اور بدعت کے اصولوں کے موافق تھا جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنے مقالہ ایران کے فلسفہ میں ثابت کیا ہے اور اکثر خطوط میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ طریقہ تفکر ایران میں انھیں مذاہب کے پیڑوں کی تعلیم سے وہاں پہنچ چکا تھا اس لیے وہاں کے تفکر و تخیل پر جاری و ساری ہو گیا ورنہ ظاہر ہے کہ یہ چیز سامی نسلوں میں قطعی موجود نہ تھی۔ ادویوں بھی یہ آریائی قوموں کی چیز ہے اور اپنے اس خیال میں اقبال کو رومی سے بہت کچھ مدد ملی جس نے جبر و قدر کو دو لفظوں میں بالکل واضح کر دیا کہ

بال بازاں راسوئے سلطان برد

بال زافاں را بہ گورستان برد

اس کے علاوہ یہ بات قرآن سے بھی ظاہر ہے جس میں صاف کھدیا گیا ہے کہ لیس اللہ الانسان الا ماسعی نہیں ملتا کسی کو مگر اتنا جتنے کے لئے وہ محنت کرے اور بالکل یہی چیز ہے جو رومی نے بتلائی ہے کہ جس میں جتنی محنت و جرات ہوتی ہے اتنا ہی اس کا رتبہ بلند ہوتا ہے ورنہ یوں زانغ اور باز دو لڑوں کے پر ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خودی کی فضا اور بقا کے متعلق قرآن شریف کا صاف حکم موجود ہے کہ لا تمخزنوا ولا تقنطروا ظاہر ہے کہ جب یہ حکم دیا جائے گا کہ نہ غم کرو اور نہ ناامید ہو تو اس سے کبھی یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اپنی خودی کو مٹا دو اور اپنی خودی کا مٹانا تو اسی وقت ہو سکتا ہے



جب زندگی اور دنیا کو ہر طرح سے سمجھا جائے اور یہی بد مذہب کا خاص پرچار ہے کہ زندگی جینے کے لائق نہیں اور دنیا فانی ہے اور دکھ اور نسا دے بھری ہوئی اس نے اس میں بھی لگانا بے کار ہے زندگی بد مذہب کے مطابق فقیہ میں اور بکشتہ بن کر گزارنا چاہیے خود کو دنیا کچھ کے اور بے ہنم رہ کے اسلام نے اس قسم کی رہبانیت کی کبھی تعلیم نہیں دی۔ کاس ہبانیۃ فی الاسلام اسلام نے مادہ کی حقیقت سے انکار کبھی نہیں کیا اور نہ اس سے الگ رہنے یا بھاگنے کی کبھی تعلیم دی۔ ہاں مادہ سے اپنی ذات اور روح کو بلند رکھنے کی البتہ تلقین کی ہے۔ مادیات کو مقصد بالذات نہیں بنایا ہر چند کہ انسان کی زندگی ہر چار طرف بظاہر مادہ سے گھری ہوئی ہے لیکن یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان اپنے دیدہ و دل دار کھے اور محض مادہ ہی میں نہ متوجہ رہے اور اسی کو اقبال فقر کہتے ہیں۔

دل از مرز حیات از غنچہ دریاب      حقیقت در مجازش بے حجاب است  
 ز خاک تیرہ می رود و بسیکن      نگاہش بر شعاع آفتاب است  
 ان دلائل کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ اقبال ایک مومن نوجوان کو جو خود ہی کی تعمیر کی اور بے خوفی کی تعلیم دیتا ہے وہ سراسر قرآن کے احکام کے مطابق ہے لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون اُس کی تلقین میں جاری و ساری ہے رہا یہ امر کہ انھوں نے صرف مسلمان نوجوانوں کو کیوں مخاطب کیا۔ کیا دوسرے جوانوں میں اس قسم کی کمزوریاں نہ تھیں جو مسلمان نوجوانوں میں پائی جاتی ہیں یا کیا یہی تعلیم دوسرے جوانوں کے لئے مفید نہ ہوگی اس امر کا شافی جواب ان کے ایک خط میں مل سکتا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر نکلسن کو اپنے ایک معترض مسٹر ڈکنس



کے متعلق لکھا ہے جو کہتا تھا کہ ان کا مخاطب مسلمانوں ہی سے صرف ان کی محبت اسلام کی وجہ سے ہے۔

”یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بچہ محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنس کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے بلکہ دراصل میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے کیونکہ تنہا ہی جماعت میرے مقاصد کیلئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنس کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مخصوص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحاد و عمومی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے

تعالو الی کلمۃ سوائہ بینا و بینکم

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقبال کی موجودہ مسلم نوجوان کی بیماری کی تشخیص صحیح ہے اور کیا ان کا طریقہ علاج جو انہوں نے بتایا ہے وہ مفید ہو گا۔ دوسرے الفاظ میں کیا اقبال کا نوجوان موجودہ تنازعۃ اللبقا اور کش مکش کو سر کرنے کے لائق اور اس میں کامیاب ثابت ہو گا اور کیا اس قدر کامیاب ہو سکے گا کہ وہ دوسروں سے بازی لے جائے۔

یہ تو بالکل حیاں ہے کہ مسلمان من حیثیۃ القوم آجکل بہت پستی کی حالت میں ہیں دوسری قومیں ان سے بہت آگے بڑھ گئی ہیں مسلمان بالکل جمود کی حالت میں ہیں اس لئے کہ کوئی راہ عمل ان کے سامنے نہیں ہے وہ ہر قوم کو آگے بڑھتے دیکھتے ہیں اور کہتے ہوئے رہ جاتے ہیں، آپس میں نفاق الگ، افراد کے سرداران الگ،



بے ذوق و سہمت، نہ ارادوں میں زور نہ دلوں میں شور اس تمام پستی کی اصل وجہ کیا ہے۔؟ پہلی وجہ تو یہی کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے دوسری وجہ یہ کہ غلط تعلیم و تربیت

شکایت ہے مجھے یا رب خدا دندانِ مکتب سے  
سبقِ شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکِ بازی کا  
ظاہر ہے کہ ایسی تعلیم پائے ہوئے نوجوان کس قسم کے نکلیں گے  
یہ بتانِ عصر حاضر کہ بنے ہیں مدرسوں میں  
نہ ادا دے کا فرانہ نہ تراش آذرانہ  
یا

وہ خرب خورده شاہین کہ پلا ہو کر گسوں میں  
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہ بازی  
غرض کہ مسلمان اور مسلمان نوجوانوں کی جو حالت آج کل ہے اس کی تشخیص اور نبض شناسی اقبال نے بالکل صحیح کی ہے اب رہا طریقہ علاج! اقبال نے پہلے بنیادی کمزوری درست کرنا مناسب سمجھی اور اس کی درستی کے لیے ان کا پہلا اور اصلی گمراہی خودی کی تلقین ہے جب انسان اپنے آپ کو صحیح راستے پر گامزن محسوس کرے گا تو ظاہر ہے اس کی وہ تمام قوتیں برسرِ کار آجائیں گی جو اس میں پنہاں ہیں اور یہی زندگی کا مقصد ہے کہ ہم اپنی تمام خوابیدہ قوتوں کو بیدار کریں اور اس طرح فطرت کے عطا یا کا صحیح اور جائز استعمال ہو سکے۔ جب دل سے کمزوری کا احساس جاتا رہے گا اور نگاہ میں روشنی اور قلب میں گرمی آنا شروع ہوگی تو ایسا نوجوان جو کچھ نہ کر ڈالے



عجب نہیں۔

جس بندہ حق میں کی خودی ہو گئی بیدار      شمشیر کی مانند ہے بر تندرہ و براق

اس کی نگہ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار      ہر ذرہ میں پوشیدہ ہے جو قوت اشراق

اور ایسا نوجوان جس کی خودی بیدار ہو گئی ہو اس کی زندگی کا کیا کتنا

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شمشاہی      نہیں ہے سحر و طفرل سے کم شکوہ و فقر

خودی ہو زندہ تو دریائے بکراں پایاب      خودی ہو زندہ تو کسار پر نیان و حریر

اقبال کا دوسرا فقر کی تلقین ہے اور درحقیقت یہ بہت بڑا اور اہم اصول ہے

دنیا میں رہنا لیکن دنیا کو مقصد بالذات نہ سمجھنا، خاک سے اور خاک میں پیدا ہونا لیکن

کرہ خاک کی سے اپنے کو سر بلند رکھنا دراصل عزم و ہمت و حوصلہ کی بہترین تربیت ہے

اور خصوصاً مسلمانوں کے لئے آجکل جب کہ ان کی اپنے نصب العین سے ناواقفیت

ان کو مختلف غلط راستوں پر ڈال دینے کے لئے آمادہ ہے۔ ابلیس زر و مال و خونیازی

و جہانگیری، حرص و طمع کے جال پھیلانے ہوئے ہے اور مسلمان کے قدم اس کی طرف

لڑکھڑاتے ہوئے اور اس غلط راستے پر بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں اقبال کی یہ بات فقر

ہنایت خوش آئند کہی جاسکتی ہے اس کے علاوہ اقبال کے کہنے کا طرز بھی کچھ کم موثر نہیں

جوش ادب و ادبی، زور و شور کے ساتھ جو ان کا اپنا ذاتی اسلوب ہے خون نوجوان کو

گرم کرنے کے لیے بہت موزوں ہے وہ مسلمان نوجوان کو گزشتہ کی بھی یاد دلاتے

ہیں اور گزشتہ کے حالات تباہی سے اکسانا اور آمادہ کرنا چاہتے ہیں کیونکہ تاریخ کی تعمیری

قوت سے وہ بخوبی واقف ہیں ان کے نزدیک

سر زند از ماضی تو حاصل تو      خیزد از حال تو استقبال تو



کبھی اے نوجوان مسلم تدبیر بھی کیا تو نے؟ وہ کیا گردوں تھا تو حیران ہے اک ٹوٹا ہوا تار  
 تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاج ستر  
 طنز سے بھی موقعے موقعے سے کام لیتے ہیں

اقبال بیان نام نہ عسلم خودی کا موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات  
 بہتر ہے کہ بے چارے مولوں کی نظر سے پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

شیخ مکتب کے طریقوں سے کشادگی کہاں یا کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ  
 غرض کہ ہر طرح سے وہ مسلم خوابیدہ کو بیدار کر دینا چاہتے ہیں دل میں درد  
 اس لیے ہر جگہ اور ہر انداز سے کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان نوجوان بیدار ہو جائیں۔  
 اب یہی بات کہ ایسا نوجوان موجودہ دنیا میں اپنا کیا درجہ رکھے گا؟

ظاہر ہے کہ جب خود میں اتنا زور پیدا ہو جائے گا اور اپنے میں اس قدر اعتماد ساتھ  
 ہی دل میں دست نگاہ میں بلندی اور جان میں سوز تو ایسے نوجوانوں کے راستے  
 میں کوئی رکاوٹیں حائل ہو سکیں گی صرف یہ نہیں کہ وہ موجودہ حالات زندگی  
 کے موافق اپنے آپ کو بنا سکے گا بلکہ انہی قوت روحانی کی بدولت وہ مصافحہ  
 زندگی میں اس قدر طاقتور ثابت ہو گا کہ اپنے ماحول اور اپنے خارجی واقعات پر  
 پورا پورا قبضہ و قدرت حاصل کر سکے گا۔ وہ محض اپنے زمانے اور وقت کی پابندی  
 نہ کرے گا بلکہ اپنے زمانے اور وقت کو اپنا پابند بنائے گا۔ اس کے علاوہ  
 چونکہ علامہ اقبال روح کی تربیت پر سراسر زور دیتے ہیں اس لئے ایسا نوجوان  
 محض کسی خاص زمانے اور خاص عہد ہی کے لیے موزوں اور مناسب نہ سمجھا جائیگا



بلکہ تمام آنے والے عہدوں اور زمانوں کے لیے کسی خاص مقام یا جغرافی چار دیواری کے لیے نہیں بلکہ ہر مقام اور ہر جگہ کیلئے مختص ہے کہ ایسا نوجوان ہمیشہ کے لیے مثالی رہے گا اس لیے کہ رُوح کے لیے صحیح تعلیم اور صحیح راستہ کامل جانا شرط ہے۔ گامزن تو وہ ہو ہی جائے گا۔ مسلمان قوم اب تک محض اس وجہ سے دوسروں کا منہ دیکھتی رہی اور دوسروں کی تقلید کرتی رہی کہ اسے اپنا جادہ یاد نہیں رہا تھا۔ عجمی تصوف نے انھیں غلط راستے پر لاکر ڈال دیا تھا اب جبکہ انھیں ایک درپیش اور دانائے راز نے صحیح راستہ دکھا دیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان قوم پھر گزشتہ کی طرح دوسری قوموں کے مقابلے میں سر بلند اور ممتاز نہ نظر آنے لگے۔

اب ایک سوال اور رہ جاتا ہے وہ یہ کہ کیا مسلمانوں کے لیے اس سے بہتر نوجوان یا مسلمان نوجوان یا کسی نوجوان کے لیے اس سے بہتر تعلیم ممکن ہے؟ بہتر و برتر ایک اضافی کلمہ ہے جو ہر زمان و مکان میں مختلف ہو کر رہا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ زمانہ کی موجودہ حالت اور دنیا کی فی زمانہ رنگ کشمکش دیکھتے ہوئے صحیح طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کے نوجوان کا تصور مکمل باعمل اور بہترین ہے، اور اس کے ساتھ ہی اتنا بھی ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس سے بہتر بھی کوئی مثالی نوجوان ممکن ہو اور ساتھ ہی وہ علمی بھی ہو تو اس کا بھی تخیل اقبال ہی کے نوجوان کی داغ بیل پر قائم کیا جاسکے گا اور اسی کی محض ایک ترقی یافتہ صورت ہوگی نہ کہ اس سے مختلف۔

آخر میں بس اب یہی کہا جاسکتا ہے کہ خدا مسلمانوں کو اس کی توفیق دے کہ وہ اقبال کے پیغام کو سمجھیں اور اپنے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس کے



بنائے ہوئے اصولوں پر کرائیں۔ کیوں اصولوں کا منبع اور مخرج قرآن ہے  
 اور انہیں پر عمل کرنے سے وہ پھر میں سر ملند اور نیک نام ہو سکتے ہیں  
 جو ان کو مری آہ سحر سے بھران شاہین بچو نگو بال پرست  
 خدا یا آرد و زو میر کا بھی ہے را نذر بصیرت عام کرے

تعلیم و تربیت کے متعلق اقبال کے چند مزید ادات حسب ذیل ہیں۔

کتب و کتابے کہ باشند جادو دانہ سم زندگی را تازیانہ  
 بہ فرزندان بیا موز این کتب و تاب کتاب و مکتب افنون و فسانہ

نہ علم چارہ سانے بے گذارے بے خیر نگاہ پاکبانے  
 نگو ترا ز نگاہ پاکبانے دے اندر دہ عالم بے نیانے

بہ آں مومن خدا کارے ندارد کہ در تن حق بیدارے ندارد  
 ازاں از مکتب یاراں گریم جوئے خود تدارے ندارد

ادب پرانیہ نادان و داناست خوش آں کو از غیب ایہ است  
 ندام آں سلطان زادہ را دوست کہ در دانش فرزند ادب است



ترا نوبیدی از طفلانِ روانیست      پروا اگر دماغِ شانِ سانیست  
 بگو اے شیخِ مکتبِ گردانی      نہ دل در سینه شانِ بہت نیست

بہ پور خویش دیں و دانش آموزد      کہ تا بد چوں مہِ انجمِ نگینش  
 بہست او اگر دادی نہر      یہ بھیناست اندر آستینش

نوا از سینہ مرغِ چمن بہ      ز خون لالہ آں سوزِ کمن برد  
 با این مکتبِ با این دانش چہ ہی      کہ تاں در کفِ نداد و جاں ز تن برد

خدا یا وقتِ آں در دہشتِ باد      کہ دلنا از دُش چوں غنچہ بکشا د  
 بہ طفلِ مکتبِ ایں ما گفت      پئے نالے بہ بند کسِ مینقا د

کسے کو لالہ را در گہ بست      ز بندِ مکتبِ دلا بروں جست  
 باں دین و بہ آ دانشِ مہر دان      کہ از اُمی بر دہشتمِ دل و دست

چو می بینی کہ ہر کار و اں کشت      چہ پر سی کار دانی را چہ اں کشت  
 مباحشِ امینِ اں علی کہ خوانی      کہ از نئے رُحِ قوے میتوان کشت  
 جو آنے خوئے گلے زنجیں کلا ہے      نگاہِ او چو شیراں بے پنا ہے  
 بہ مکتبِ ہمیشی را بیا موخت      میسرِ ناپیشِ برگِ گیا ہے



# خطوط واجد علی شاہ بنام شیدا بیگم

— :: X :: —

(واجد علی شاہ کے خطوط کے مجموعے اُن کی اپنی بیگمات کے نام اکثر ملتے ہیں۔ کچھ چھپ بھی چکے ہیں کچھ ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کی چھٹی بیگمات میں سے ایک کا نام شیدا بیگم تھا۔ یہ حسین علی خاں ساکن محلہ پاٹانا، لکھنؤ کی بیٹی تھیں۔ اور غدر کے بعد واجد علی شاہ کے ہمراہ کلکتہ (میا برج) نہ جا سکی تھیں ان کے نام واجد علی شاہ کے اور ان کے واجد علی شاہ کے چند خطوط مخزن اسرار سلطانی میں شائع ہو چکے ہیں۔ (رسال طباعت ۱۹۰۲ء) لیکن یہ مطبوعہ نسخہ بھی اب نایاب صرف سید مسعود حسن رضوی صاحب کے پاس اس کا ایک مطبوعہ نسخہ موجود ہے اسی کتاب کا قلمی نسخہ کلکتہ میں آصفیہ حیدر آباد کن میں ہے جس کا خلاصہ نصیر الدین ہاشمی صاحب، رسالہ "آج کل" مطبوعہ اپریل ۱۹۵۴ء میں شائع کیا ہے۔

لیکن انھیں شیدا بیگم کے نام واجد علی شاہ کے خطوط کا ایک ہمارے زرکار نسخہ ابھی حال ہی میں سری نظر سے ہیاں لکھنؤ میں گزرا۔ اس میں صرف ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲ کے خطوط ہیں جو تاریخی ترتیب سے نمبر دار لکھے گئے ہیں



کل خطوط کی تعداد اڑتیس ہے لیکن چونکہ یہ نسخہ ناقص الطرفین ہے یعنی  
 شروع کا ایک صفحہ اور آخر کے ہنہیں معلوم کئے جیسے غائب ہیں۔ اسلئے  
 نہیں کہا جاسکتا کہ پورے نسخے میں کل خطوط کی تعداد کتنی ہوگی بس ۱۲۷۴ میں  
 کل آٹھ خط ہیں جن میں پہلا ناقص ہے۔ ۱۲۷۴ کے بقیہ تیس خطوں  
 میں سے اکیسواں، ستائیسواں اور تیسواں ناقص ہیں۔ بائیسواں تا پچیسواں  
 اور اٹھائیسواں نادر ہیں۔ اس حساب سے تمام و کمال خطوط کی تعداد اس  
 نسخہ میں اڑتیس ہے۔ یہ نسخہ موجودہ ناقص حالات میں چھپتے پتلے ایکسپاز  
 کے ادراک پر مشتمل ہے اور زرکاری کی آپ اپنی مثال ہے۔ میں نے اس قدر  
 مطالعہ مذہب کوئی نسخہ کسی کتاب کا اب تک نہیں دیکھا۔ ہر طرف تین طرف  
 جدول میں کوئی کڑھائی افخ کی چوڑی بیل آب زر سے بنائی گئی ہے۔ ہر  
 چوتھے صفحہ پہلی کاڈزائن بدل دیا گیا ہے۔ اجزاء کی سلائی کی جانب بھی  
 کسی ذکسی وضع کی چلی بیل آب زر سے بنا کی گئی ہے متن میں ہر صفحہ پر صر  
 سات سطریں ہیں۔ اور بین السطور میں بھی سونے کا پانی بھرا گیا ہے۔ یہ سب  
 نقش کا بنی کسی استاد فن کار کی رہن موفلم معلوم ہوتی ہے کیونکہ بہت خوبصورت  
 اور متناسب نقوش میں پھول، پھل و خوش و طیور، مختلف شاہی سواروں  
 اور کمانوں کی شہنشاہی عمارتوں کی عکاسی کی گئی ہے گمان غالب یہ ہے کہ یہ نسخہ  
 خورشید ابگم کے لئے تیار ہوا ہوگا۔ افسوس ہے کہ یہ نسخہ اچھی طرح محفوظ نہیں کیا  
 گیا ہے اور اگر کسی قدر دیاں کے ہاتھ نہ لگ سکا تو یقیناً ضائع ہو جائے گا۔  
 ذیل میں اس نسخہ کے تمام ناقص و مکمل خطوط کی نقل پیش کی جاتی ہے اصل



نسخے میں تاریخ اور عنوان محبت نامہ اور نواب شہید ابیکم کا نام سرخ روشنائی سے درج ہے۔ فقط جان عالم، گیس طلانی حروف میں کہیں سرخ روشنائی سے۔ اسی نسخے کے دو تین خطوط تصدیق حسین صاحب دیکھ لکھنے کے لئے رومی آواز میں ۱۹۵۳ء میں شائع کرائے گئے تھے

طوطی حسن کو گفتار میں کرتے ہیں اسیر  
آنکھ نے آنکھ سے دیکھا نہیں یہ چہرہ خوب  
ہر میں نور میں صباب ہیں پر دیں ہیں سہیل  
سیکڑوں سروگستاں میں بنے ان کے غلام  
مردم چشم کے ہیں رنگ ہیں خساروں کے  
شہد و شکر نہ ملے ان کی ترش کامی سے  
دیکھ لے اسکو کوئی اس بت خوش عشوہ میں

بلبل ابیستم ایجاد ہیں شہید ابیکم  
قدرت حسن خداداد ہیں شہید ابیکم  
چاند ہیں غور ہیں نیل میں شہید ابیکم  
باغ عالم میں آزاد ہیں شہید ابیکم  
خانہ جان میں آباد ہیں شہید ابیکم  
میں جو شریں مولیٰ فراد ہیں شہید ابیکم  
آخر زار کی کو داد ہیں شہید ابیکم  
کیوں پیاری اب تو ہمارے دل کا حال خوب تم پر کھلا، سنو شیدا اب  
تاب مہاجرت نہیں، دل پر درد میں طاقت نہیں دیکھیں تم سے کب ملیں گے  
کب دیکھیں گے اور یہ غزل ہم نے عجب وقت میں کہی ہے۔ خیر محقار ادل خوب جانتا  
ہے اور یہ جلدی جلدی لکھے جاؤ کہ اب یہی باعث تسکین ہے اس سے دل کے  
کھڑنے کا یقین ہے اور طبیعت کا اپنی حال کیا بیان کریں دیے ہیں۔ فقط  
راقم جان عالم محررہ چارم زیح الاولیٰ ۱۲۷۲ھ

۱۔ یہ محبت نامہ ادل کا آخری جزو ہے۔ ن



## محبت نامہ دوم :-

آفتاب عالم تاب سائے خوبی، دُر در پائے محبوبی، گلزارِ استِ باد تار،  
 نیک خو، آئینہ رو، رنگین ادا، مہ لقا نواب شیدا، سلیم صاحبہ کو جان عالم غریب الوطن  
 اسیر رنج و سخن کی طرف سے معلوم ہوا، ۲ ربيع الثانی کو دو قطعہ خط محبت طراز  
 تمہارے معرفت انجم الدولہ بہادر کے ہمارے پاس آئے کمال خوشی حاصل ہوئی۔  
 زردی رخ و نور سرت سے زائل ہوئی۔ مضمون مندرجہ حروف بحرف ظاہر ہوا کمال  
 اطمینان خاطر ہوا عبارت محبت انگیز نے عجب رنگ دکھایا۔ رنگ کدورت آئینہ دل  
 محبت منزل سے چھڑایا جب مضمون فراق پڑھا حال اشتیاق بڑھا، ہر چند نسبت  
 تحمل مزاجی کے ضبط کیا مگر بے اختیار اشک حسرت چشم تنہا سے گر پڑے اور کو فلک  
 سے دیکھ کر یہ مصرعہ پڑھا کہ کیوں اے تم گارتیری حیا و ظلم کی آخر کچھ انتہا بھی ہے  
 کب تک آخر تیری کج روی سے گردش میں ہے صدمہ فراق کی کاہش میں ہے خیر اگر  
 اُس کا فضل شامل حال ہے تو فلک کو آزار کا محض خیال ہے دم بھر میں سب کام  
 سنور جائیں گے، ساغرِ تمنا حق مراد سے بھر جائیں گے۔ اے جان اب کچھ  
 تردد کا مقام نہیں رنج کا کام نہیں مہملوں سے ہمیں فراغت ہے۔ بحال طبیعت  
 ہے خدا تمھاری بد مزگی مزاج کی دور کرے، ہمارا دل مسرور کرے اور پر خوردار  
 رنگین آرا رقیہ بانو سلیم صاحبہ کو جو لکھا ہے کہ خدائے حسن یوسفی دیا ہے۔ اشارہ  
 بہت پیاری ہے بعینہ صولت تمھاری ہے مگر ابھی تشکیل ہونے کا اعتبار نہیں۔  
 لوگ کوتاہی قرار نہیں۔ ایسا نہ ہوگا اشارہ شرور برد حسن و اقبال زیادہ ہوگا  
 جاہ و جلال زیادہ ہوگا اور تم نے جو واسطے تیاری زیور کے صورت لکھی ہے۔ وہ آخر

نوٹ :- یہ خط ۱۲/۳/۱۳۴۳ھ کا ہے کیونکہ اس میں جس لڑکی کا ذکر ہے وہ ۱۲/۳/۱۳۴۳ھ میں پیدا ہوئی تھی دیکھیے خط  
 دوم از ہم ۱۲/۳/۱۳۴۳ھ



کیونکہ منظور ہو جو عقل سے دور ہو۔ خدا نے ابھی بہت کچھ دیا ہے سرانجام اس امر کا  
کیا ہے۔ حکم واسطے تحریر حکمنامے کے بیاں کے کارندوں کو مفتاح الدولہ کے نام پر  
آیا۔ بجز دینی حکمنامے کے زیور حسب ضرورت تیار ہو جائے گا، آئندہ جب خدا  
امید بر لائے گا دل کا اور جو صلہ بھی نکل جائے گا۔ فقط زیادہ شوق۔

راقم دجان عالم محررہ ششم ربیع الثانی ۱۲۷۲ ھ ہجری

### محبت نامہ سوم۔

ماہ نقا، ہر ضیا، پری جمال، حور تماں، سرود قد، خورشید خدا، خوبی مجسم، نجمہ شیم،  
نواب شیدائیکم صاحبہ دولت عشق سے الالال رہو۔ سند خور می، اور بجل بے غشی  
گنجینہ محبت اور خزینہ مسرت، معنی مکتوب بحیت اسلوب ایک قطعہ لکھا ہوا بیوس کا  
اور دوسرا قطعہ ایکسویں ربیع الآخر کا کنز الدولہ بہادر کی معرفت دد نوں برابر شمع نیم وصول  
گلہ رسہ چمن حصول ہوئے، نشہ الفت دوبالا اور سرد الفت زیادہ ہوا۔ حکایت فراق  
اور قصہ اشتیاق سن کر دل مضطرب گھبرا یا، کلیجہ منہ کو آیا۔ ہمارا حال کو تنو ساری  
کہانی اپنی بھول جاؤ۔ جامع المتفرقین اس دوری کو دور کرے شادی وصل سے سرور  
کرے اور حال مسافرین لندن کا کیا لکھوں۔ خیر و عافیت سے ہیں ابھی کوئی مردہ  
روح مقوی دل نہیں حاصل ہوا جس وقت فضل خدا ہو گا چرچا جا بجا ہو گا۔ ہمارے  
لکھنے کی نوبت بھی نہ آئے گی کہ تم تک آواز جائے گی۔ بد خودار زنجین آرا بیگم کو  
دعا کہنا۔ رقمہ شوق دجان عالم

۲۹ ربیع الآخر ۱۲۷۲ ھ ہجری



## محبت نامہ چہارم

محبوب فرزند، وحید زاد، ہر سائے خوبی، آفتاب محبوبی، جان عالم نواب شہدائے  
صاحبزادہ جہان و محبت۔ خطا تمھارا ہم کو سادیں تاریخ زریح الثانی معرفت منشی صفدر کے  
پسپا اور وہ غزل جو تم نے کبھی بھی جس کا مطلع یہ ہے

خداوند اد سے جلد صورت جان عالم کی  
ہست عشاق اس شہد کو فرقت جان عالم کی  
ہم نے دیکھی اور بہت مزہ اٹھایا اور حال مفارقت نے عجب رنگ دکھایا  
ہائے ہم اور تم سے جدا ہوں اور امنوس ہے کہ ایسی آفتوں میں مبتلا ہوں  
فلکند دور ز کوئے آواز سسیدہ بکام  
جفا زیادہ ازیں بخت مار سا چکند

گر تم نے یہ جو لکھا تھا کہ نواز شاہزادی طو لمر با سے بہ سبب رنج ہجرت کے میں اب  
بجود ہوں اور سوائے تمھارے جان و تن کی بھی خبر نہیں ہم کو دیکھو کہ علاوہ تمھاری  
مفارقت کے کہ یہ بھی ایک صدمہ جانگزا ہے اور ایک سر ہزار سودا ہے لیکن  
تم کو نہیں بھولے اچھا یونہی سہی۔ خیر تمھاری خوشی اور اپنے دفتر الم کو کھانٹک  
کھیں غزل تو کیا دیوان میں بھی گنجائش تحریر نہیں مگر ان چند بیتوں پر قیاس کرو۔

تائے گنتے ہیں رات بھر ہم	جاگاکرتے ہیں تا سحر ہم
ہے نیند کے کہ آ کے لیئے	لینے جو کبھی تو منہ لیئے
اٹھے جو کبھی تو روکے اٹھے	سائے تکیئے بھگو کے اٹھے

اور سنو صاحب دالہ شام سے صبح اور صبح سے پھر شام ہو جب بھی دفتر غم نہ تمام



لہذا طول کو فضول سمجھ کر اختصار کیا بقول تمھارے جلد جناب باری ایام جدائی کو دور کرے  
اور شراب وصل سے سرور کرے۔ فقط

ہشتم جمادی الاولیٰ ۱۲۷۲ھ ہجری

## محبت نامہ پنجم

نواب شیدائے عالم کو جان عالم کی طرف سے معلوم ہو پانچ مہینے کا زمانہ مقتضی  
ہوتا کہ اصلاً تمھارے مزاج کی خیر و عافیت سے ہم آگاہ نہیں طبیعت بہت مشوش  
رہتی ہے خدا جانے میں نے تم صاحبوں کی کون سی تقصیر کی تھی کہ آج تک بیگوں  
بھر میں سے کسی نے ایک پرچہ کا غذا نہ کچھ کر بھیجا۔ رحم کر کے مفصل اپنی طبیعت کا حال  
لکھ کر بھیجو کہ جی لگا ہو ہے اور حل کا بھی حال لکھ بھیجو کہ ہے یا نہیں۔ اس میں کچھ نقصان  
نہیں اور یہ بھی لکھنا کہ کیا سبب جو آج تک تم نے اپنے مزاج کی خبر نہ لکھی۔ راقم  
جان عالم مصیبت زدہ دوم ذی قعدہ ۱۲۷۲ھ

## محبت نامہ ششم

نواب شیدائے عالم کو جان عالم کی طرف سے معلوم ہو نامہ محبت ضمیمہ دل پرور  
روح افزا پہنچا۔ نیم کی طرح غنچہ دل کو شگفتہ اور خاطر غمگین کو شاد و سرور کیا، ہاں اداں دوست  
کو دوستانہ راغزائے دل و راحت جاں فرسید مقتضائے الفت و محبت یہی ہے  
کہ اسی طرح ارسال مکاتبات فرحت آیات سے دل غم رسیدہ فراق دیدہ کو قرن  
تسلّی و تشفی کرتی رہو۔ جو حال ہمارا تمھارے ہجر میں رہتا ہے اس کے لکھنے سے سینہ قلم



شق اور رنگ چہرہ قرطاس فق ہو تا ہے سب ہم صحبت دیکھ دیکھ کر آہ سرد دل پر  
 سے بھرتے ہیں اشک خوں چشم گریاں سے جاری کرتے ہیں بقیاب و بے قرار  
 ہو ہو کر درگاہ جامع المتفرقین میں یہی دعا کرتے ہیں کہ آہی جلد جان عالم کو اس  
 مہ پارہ سے ملا دے تماشا قرآن السعدین کا دکھا دے۔ گھل و بلبھل کی طرح صحبت  
 نصیب ہو حبیب کو حاصل وصلت حبیب ہو، خدا ان کی جلد دعا قبول کرے  
 کہ صدمہ فراق اور رنج جدائی سے ہم نجات پائیں گو یا دوبارہ حیات پائیں۔ عیش و  
 آرام سے مطلق آگاہ نہیں ہیں۔ صبر و تحمل قابو میں والشر نہیں ہیں۔ ہر دم ہی تمنا  
 ہے کہ کسی طرح تم تک پہنچوں۔ گھمائے وصال سے دامن آرزو بھریں یقین ہے  
 کہ مسبب الاسباب عنقریب اپنے فضل و کرم سے یہ سب سامان مہیا کر دے  
 اور دل جس طرح چاہتا ہے آنکھوں سے بھی دکھا دے اس کی قدرت سے کچھ بعید  
 نہیں ہے۔ راقم غریب الوطن جان عالم صفی عنہ دہم ذی الحجہ ۱۲۷۲ھ۔

### محبت نامہ ہفتم

نواب شیدا بلیگ صاحبہ کو جان عالم کی طرف سے معلوم ہو۔ نظم ۷

جو گزری ہے مجھ پر کروں کیا بیاں	بہت درد و آگے سن کے اس کا بیاں
ستم کون سا مجھ پہ گذرا نہیں	بیاں اس کا کرنا اب اچھا نہیں
بھلا کس سے کتنا میں یہ دار و دات	کہاں میں کہاں ہجر ہے طرفہ بات
ہمارا تو اب کچھ نہیں دسترس	فقط غم زدوں کا ہے آنکھوں پر بس
پڑے عشق میں دکھ اٹھاتے ہیں ہم	شب و روز آنسو بہاتے ہیں ہم



مصیبت میں اک اک گھڑی بہتے ہیں  
عجب سینے میں عشق کا جوش ہے  
نہ کھانے نہ پینے کے مجھ کو حواس  
مگر اپنے خالق پہ ہوں میں نثار  
اسی کا ہمیشہ رکھا آسرا  
کہ خطیرا آپہنچا طالب کے پاس  
ہے اس دم کی کیا نیک اک اک گھڑی  
بس اب بھر غم سے نکالو مجھے  
نہیں اور یا توں کا جو یا مزاج  
مری جاں کو اب یہی دھیان ہو  
جو ایذا سی ہے ٹھکانے لگے  
محبت کا سب حال آئینہ ہے  
مگر اے فلک تیرا خانہ خراب  
مگر چرخ کا کیا گلا کیجئے  
یہ اور ایک تازہ مصیبت ہوئی  
بلا لو مجھے اب تم اے جانِ جاں  
کہ ہر ڈھونڈھوں گا اور کہہ جاؤنگا  
نہ چلتے ہوئے بھی پکارا مجھے  
نظر میں نہ کیونکر ہو عالم سیاہ

نرخ زرد پر اشک خوں بہتے ہیں  
ٹھکانے سوا سب فراموش ہے  
متم لو جو بدلا ہو میں نے لباس  
کہ ہیں نا امید اس سے امیدوار  
اسی نے سنی میری آہ سردھا  
و یار روح آہنچی قالب کے پاس  
کہ اک اک گھڑی میں خوشی ہے بڑی  
تم اپنے گلے سے لگا لو مجھے  
گلے ملنے کی ہے فقط احتیاج  
ہم آغوش ہونے کا ارمان ہو  
مزارِ روح دونوں کی پانے لگے  
لبوں پر لب اور سینے پر سینہ ہے  
دکھاتا ہے تو ہر زمان انقلاب  
نصیباً بُرا ہو تو کیا کیجئے  
کہ معشوق عاشق میں فرقت ہوئی  
سنبھالو مجھے اب تم اے جانِ جاں  
بس اب تیری فرقت میں مر جاؤنگا  
غرض جیتے جی تو نے مارا مجھے  
نہاں تم ہو آنکھوں کے اے رشک ماہ



دلِ شاہ کا بھی بُرا حال ہے  
یہ حبیبِ دلی شہر کو غم رہے  
مگر چرخ ہے درپے انتقام  
فلک کا بت تنگ ہے حوصلہ  
پھرا ہوں میں الفت کے میدان میں  
غرض تیرا اختر ہے صحرا خورد  
درختوں کو حسرت سے لکھا ہوں میں  
تو دردِ عالم سے وہ پامال ہے  
بیا شہر میں کیوں نہ ماتم ہے  
کہ کیوں دو ہوئے تھے وہاں شاد کام  
کہ دو کو بٹھاتا نہیں ایک جا  
بگولہ بنا ہوں بیا بان میں  
ہر اک آنکھ ہے سرخ چہرہ ہے درد  
تو دیوانہ وار ان سے بکتا ہوں میں

تمہیں میری ہو جاؤ حسامی ذرا

مرے سرو کا تم بتاؤ پتا

راتم بوطن اسیرِ محن جان عالم عفی عنہ ۱۲ رذی الحجہ ۱۲۷۲ھ

## محبت نامہ ہشتم

شید ابیکم کوافر کی امان۔ جان عالم پوچھتا ہے مزاج کیسا ہے اور اپنا تو یہ حال

ہے۔ نظم :-

ترے عشق میں جو گزری لکھوں کیا وہ حال اپنا

پے حسنِ خوش ادا بھی تو دکھا جمال اپنا

مری جاں مجھے الم ہو تو ہے دل میں عشق کم ہے

مجھے حیراب ستم ہے نہ ہوا دصال اپنا

اری بد مزاج دنیا مرے سر پہ تاج دنیا

کوئی بوسہ آج دنیا نہ چھپانا مال اپنا



مری جان کیا کیا ہے ترا دل تو بد مزہ ہے

تری زلف میں پھنسا ہے اے بال بال اپنا

ترے رخ سے لے گل تر جو ہوا ہے عشق (ہم کو)

کہیں رکھ دے لے بمن بر اسی منہ پہ گال اپنا

عشق رخ نے گھلا مارا۔ شمع شب فرستے جلا مارا۔ انجمن تنہائی میں شمع  
کی طرح آنسو بہتے ہیں۔ ساتھ دے باتیں کرتے ہیں ہم چپ رہتے ہیں چکڑ عشق  
روز اتر اتر کر ٹھوکر سٹکھاتا ہے ماہ حسن یا رتک جا نہیں سکتا بھر بھر آتا ہے۔  
فراق نے تیری ہڈیوں کو شمع کی طرح سے جلا دیا تیل بنا کر ہر ہر گ سے بہا دیا،  
گوشت مشتاق کلام یا رہیں جان دینے پر تیار ہیں، آنکھیں نظارہ جمال جہاں آراہ کی  
یاد میں اشک فشاں ہیں تصور خال چہرہ نہیں ہے، سینہ پر سنگ گراں ہے عقیق  
لب تیرے دل مل کر لہو نکالتے ہیں ہم ہندی کی طرح لے جاتے ہیں بہت اپنے  
کو سلٹھاتے ہیں حسن تیرا استخوان درد رسیدہ کی تاک میں آگاہ ہوا ہے۔ ہائے  
ہمارا دل ہم سے کہیں دور گیا ہوا ہے لے ریزہ الماس اب ہجر بے سود ہے وصال  
تیرا ہائے بے بہود ہے۔ قسم مجھے درخشف کی کہ تو آؤ ریزہ گوشت جان عالم ہے۔

راقم جان عالم ۲۵ ر ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ

آغاز نامحات مرسلہ ۱۲۷۳ھ

محبت نامہ اول

محبوبہ خاص، معشوقہ بااختصاص نواب شیدا بگم صاحبہ زادہ اسد محبتہا بعد



اتھار اشتیاق ملاقات جہانی معلوم ہو کہ محبت نامہ تمھارا عین انتظار میں غرتہ محرم کو پہنچا  
سرور بخش دیدہ دل ہوا، مضمون سے اس کے بہت مزاجی کو حاصل ہوا۔ سنو  
جانی شاعر

دشمن بھی اپنے دوست سے یارب جدا نہ ہو

تا آشنا بھی کوئی الم آشنا نہ ہو

کیا لکھوں کیا تمھارا بار غم فراق اٹھاتا ہوں اب سنو خود بھی رو کر لکھ رہے  
تمھیں بھی رلاتا ہوں تم کو تو میرے وہاں ہونے کی یہ خوشی ہوتی میرے دل کا حال  
کہو کہ مجھے اس امر کی شادی کیسی ہوتی۔۔۔ اس تصور میں کیا دل کا حال ہو گا۔  
کیا کیا جی کو ملال ہو گا، افسوس فلک نے یہ دن دکھایا کہ اک زمانے کو اپنے سے  
بیگانہ پایا۔ ہر دم تصور اپنے سب پر میزادوں کا پیش نظر ہے اس رنج میں کبھی درد  
دل ہے کبھی درد جگر ہے کس سے کہوں جو دل پر گزرتی ہے کیا کیا آندھی فراق  
محبوبان چھڑ کرتی ہے جان من ایک دل پر کس قدر ہجوم حسرت ہے میدان غربت  
بدتر از صحرائے قیامت ہے حق تعالیٰ تمھارا دل دولت فرزند سے شاد کرے  
تمھیں کہیں جلد بامراد کرے، تصور تو کرو جب ہمیں تمھارے زچا بننے کا خیال  
آوے گا دل سینے میں کیا کیا تر پے گا، کیا کیا گھبرائے گا اور تو کچھ بس نہیں دل موس کر  
رہ جائیں گے خیر خفیں بجا ریت مشاطہ خیال تصور میں دوہن بنائیں گے۔ آغوش تصور  
میں لے کر پیار کر لیں گے۔ اسی طرح تسکین دل سے اختیار کر لیں گے، اپنے  
دُراشتک کی رتوں کا سہرا باندھ کر دیکھ لیں گے۔ نعل سخت جگر کا بار تمھیں بھار  
اے دلبر دیکھ لیں گے کس رنج میں یہ شادی مقدر نے دکھائی۔ کس ہنگام میں



ہماری تمقاری ڈالی جدائی مگر اسے راحت جاں اس میں بڑی بڑی قدت ہے  
 اُس کے آگے یہ کب حقیقت ہے جو ہم کو تم سے پھر جلد تر با مراد ملائے پھر اسی  
 طرح تم سب کو ہمیں دکھائے، تم نے جو نفرتی مسہری کے باب میں لکھا ہے  
 جان من بغیر تمقارے آئے اس کا کھٹنا ممکن ہو نہیں سکتا ہے مگر فرش ضروری  
 کے باب میں حسام الدولہ بہادر کو اور مفتاح الدولہ بہادر کو تاکید کھدی ہے  
 انشاء اللہ تعالیٰ تحفیں بروقت مل جائے گا۔ بہت نصیحت کی ہے لیکن تم سے  
 عجب ہے کہ تم جو رد ہو کر ہمیں عرضداشت لکھو اور آج تک ہماری مزاج داں ہو  
 رانم تغریب الوطن (جان عالم)  
 مقلدائے ریخ و سخن

## محبت نامہ دوم

نواب شیدا بگم صاحبہ، گل سرسبد بوستانِ رعنائی، مرغِ مرغِ سرسبز  
 باغِ زیبائی، زید اللہ جمالہ۔ شنوی تمقاری عین انتظار میں پہنچی قوت بخش  
 جان منناک ہوئی۔ ایسی بول چال اس میں تھی کہ طوطی عقل چھوہ لڑائی سے باز رہا  
 سبحان اللہ شنوی نے حیات تازہ عطا فرمائی آنکھوں میں روشنی کراست  
 فرمائی، ہر بیت اس کی بیت آبرو تھی، ہر سطر خوشبو تھی۔ اندازِ داد اسے  
 بھری تھی۔ شنوی کا ہے کو تھی حور تھی یا پری تھی۔ میں نے تمقارے جنت کے  
 سامان کو مبارک الدولہ کو بخوبی سمجھا دیا ہے یقین ہے کہ کسی صرح کی تکلیف  
 نہ ہو اور جو کوئی امر لاحق حال ہو تو اسے صراحتاً سمجھو تاکہ ابھی سے اس کے  
 رفع کے واسطے اہلکاروں کو حکم دیا جائے اور حتی الوسع ضرور یاد شاہ منزل



میں جننا آگے بھی لکھ چکا ہوں اور اب بھی لکھتا ہوں سامان وہی سب کرنا جو  
 کچھ نواب بگیم نے کیا ہے قناتیں بادشاہ منزل کے واسطے نکلوا دی ہیں اور  
 اب تم ہر وقت مجھے اپنا شیفتہ جاننا، حق تعالیٰ کے حفظ و امان میں دیا تمہیں  
 اور تمہارے پیٹ کے بچہ کو، کیا کریں دور ہیں نہیں ہزاروں حوصلے نکالتے  
 جس طرح چاہیے تھا اسی طرح اسے پالتے، یہاں ہر گونہ فضل الہی ہے  
 تباہی بادشاہی ہے تمہیں مناسب ہے کہ ارقام و ترقیم خطوط میں غفلت نہ  
 کوتاہی نہ کرو، اور تاملنے دولت مواصلت چشمہ خطوط جاری رکھا کرو کہ موجب  
 ہماری تسکین ظاہری اور تشفی باطنی کا ہے اور ہم ہمیشہ تمہیں یاد کرتے ہیں۔  
 دل ناشاد کو آباد کرتے ہیں۔ اپنے جناب والد بزرگوار حسین علی خاں صاحب  
 کو اور جناب والدہ صاحبہ ماجدہ قبلہ و کعبہ کو بہت بہت میری طرف سے  
 بعد ہزار اشتیاق معانقہ جہانی و مصاحفہ روحانی بندگی کہہ دینا۔ باقی یہاں  
 ہر طرح فضل الہی ہے امید استرداد ملک شاہی ہے۔ مرقوم ۱۶ محرم الحرام ۱۲۴۳ھ

دراقمہ جان عالم

## محبت نامہ مسموم

شیدا بگیم، میری جانی، جب سے ہم پر یہ آفت ناگہانی یعنی فراق نصیب  
 ہوا۔ صورت دیکھنے کو ترستے ہیں سادون بھادوں آنکھوں سے برستے ہیں  
 کبھی سرخ رنگ گال یاد آتے ہیں تھائے انگریزی کپڑے پہن کر چھتری ایک  
 ہاتھ میں لے کر گاڑی میں ہمارے ساتھ بیٹھنا یاد دلاتے ہیں ہم کلیجہ بھتام



لیتے ہیں صبر اور ضبط سے کام لیتے ہیں۔ تیرہویں تاریخ ماہ صفر المنظر  
 میں رقمیمہ تو دو ضخیمہ شعر حال اشتیاق اور فطر اضطراب عین عالم انتظار میں  
 کپتان کنز الدولہ کی معرفت چہرہ آراءے گلگونہ برعلا ہوا۔ جان عالم اٹھ کھڑا  
 ہوا پیشوائی کو جلد سر پر رکھا، پوچھا کیجیے سے لگایا۔ آنکھوں میں شدت ضبط  
 سے پانی بھر آیا۔ جان گھبرانے لگی، طبیعت سنسنانے لگی۔ دل نے کہا، اکی  
 خیر ہو بس فقط حال اشتیاق ہے کہ سیر ہو، راقم کا دل دھک دھک کرنے  
 لگا، پسینا سر کا پاؤں تک اترنے لگا، دل دڑتا تھا کہ خدا جانے کیا کھا ہی  
 مقدمہ تنخواہ سے یا شکوہ زچا خانہ ہے بارے فضل خدا ہوا۔ صرف اظہار  
 اشتیاق و وصال ہی تھا اور کچھ نہ تھا۔ سجدات شکر درگاہ جناب باری میں  
 ہزار خوشی سے بچائے کہ اس خط میں شکوے نہ سننے میں آئے۔ مسہری کے واسطے  
 میں نے پھر تاکید بھی ہے انشاء اللہ چاندی کی مسہری زچا خانے کے واسطے  
 بہت خوبصورت دستیاب ہو گی کہیں اس کے ملنے کے پہلے نہ جن بیٹھنا ہماری  
 خاطر کرنا مسہری آ لینے دینا۔ خورد محل کو بھی لکھا ہے اور محمد حسن خواص کو بھی  
 کہا ہے کہ تو بھی کچھ بھیج اور تم کو بھی لکھتا ہوں کہ فیصلہ پسند کو تھی میں ایک مسہری  
 چاندی کی فیل چہرہ لگی ہے مکان داروں سے کہہ کے نکلوا لینا۔ زیادہ  
 ہم سوائے اشتیاق ملاقات اور کیا لکھیں۔ فقط مرقوم سیر دم صفر ۱۲۴۳ھ  
 راقم (جان عالم)

محبت نامہ چارم

مجمع فیوض جلیہ، منبع بتان جلیہ، یار شکیلہ ذاب شہدایکم صاحبہ یزید شہزادہ



آبیاری سحاب مکرمت اور ترشح ابر مدار محبت کو ہمراہ چمن خزاں رسیدہ فراق لیکر  
 اور گلدستہ متنائے وفاق اس معشوقہ بلبل صفت کو نذر دے کر عند لیب ترانہ  
 سنج مدعا کو باغستان ہیان میں چھوڑتا ہوں تیر پر وازی سے طوطی قلم کے پرو بال  
 موڑتا ہوں۔ اے گلبن باغ شاد کامی اور اے نوہال چمنستان نیک نامی  
 مرغ نفس کی طرح ہم تیرے ہجر میں نالہ اور فریاد کرتے ہیں۔ سرخاب کے مانند  
 اپنے جوڑے کو یاد کرتے ہیں ستر صویں تاریخ ماہ صفر المنظر ۱۲۴۳ ہجری میں  
 کنز الدولہ بہادر کی معرفت تمہارا خط صنیا بخش چشم منظر ہوا مصنون اشتیاق اس  
 کا دل مشتاق پر ظاہر ہوا حقیقت یہ ہے کہ ہر فقرہ محبت خیر اور ہر لفظ الفت  
 انگیز تھا۔ سیاہی نے اس کی روشنائی چشم بڑھائی جلوہ بیاض بین السطور میں نور  
 کی تجلی پائی اب تو کمال شوق ملاقات ہے دل بے تاب سے یہی پیروں حرف  
 دھکیلات ہے اب تاثیر جذب دل دکھاؤ کشش الفت سے ہمیں جلد بلاؤ۔  
 اب ہجر کی راتیں کانٹے نہیں کٹتی ہیں ہماری آہ زاری سے سننے والوں کی  
 چھاتیاں پھٹتی ہیں۔ ہمایئے ہمارے نالہ شگیر سے تنگ آگئے ہیں۔ غم خوار  
 روز کی بیقراری دیکھ کر گھبرا گئے ہیں محقق منصف ہو کہ ہمارے حال سے  
 آگاہی ہے ہم تو شتر ہجر رگ جاں سے آشنا نہ تھے۔ درد مفارقت کی  
 لذت سے زبان دل آگاہ اصلاً نہ تھے۔ جان من بہتے بہتے ہمیں گے  
 خار فراق اٹھتے اٹھتے اٹھتے گلاب فراق، بس اے فلک اب تاب ضبط  
 اندائے فراق نہیں، دل کو تحمل کاوش خار فراق نہیں الہی جلد پرو فر  
 مفارقت اٹھا دے جلوہ رخ دلدار دکھائے۔ راقم جگر رش جان عالم الفت  
 ، اے صفر ۱۲۴۳ ہجری۔



## محبت نامہ پنجم

حسینہ خوش ادا قمر طلعت ماہ لقانواب شیدا بگیم صاحبہ زید اللہ جمالہ  
انیسویں تاریخ نامہ عنبریں شامہ آفتاب الدولہ بہادر کی معرفت پہنچا، ہم نے  
اس کے جواب میں یہ اپنی غزل تمھارے عشق میں تحریر کی۔ غزل آخر یہ ہے  
مسکرا باغ میں تو اے گل خنداں میرے

میں تو عاشق ہوں ترے دم کا دل دجاں میرے  
مصرع غیر سے ہرگز مجھے کچھ کام نہیں  
مانل گوشت سگ ہوں گے نہ دنداں میرے  
درد و غم رنج و الم طیش و طیش عشق سے ہو  
آج خاطر مری کر سینے میں کہاں میرے  
آنکھ پھوڑوں گا جو آنسو نظر آ یا مجھ کو  
کھل کے رونا نہ کہیں اے دل پہناں میرے  
اس پر نیراد کے سایے سے بچا نا مجھ کو  
پھونک دینا نہ مجھے اے دل سوزاں میرے  
غل مچاتا ہوں بڑی دیر سے اے زنداں باں  
سلسلہ مجھ سے بھی رکھنا کوئی زنداں میرے  
بے دھڑک محفل اغیار میں گھس جاتا ہے  
پھنس نہ تو کافروں میں سیدھے مسلمان میرے



بھیڑ یا ہو گئے الفت سے تری سارے عزیز  
 کیوں نہ چاہوں کچھ اے یوسف کنعاں میرے  
 سر و گرد گڑ گئے صحبت سے زمیں پہ تیرے  
 قد کشی باغ میں کر ان سے گلستاں میرے  
 پہلی تاریخ سے مشتاق ہم آغوشی ہوں  
 چودہویں رات ہے مل اے مہ تا باں میرے  
 بے مزہ ہو کے وہیں رشک سے جل جاتا ہے  
 چومتا ہے وہ اگر لعل بدخشاں میرے  
 پر لگا دیتا ہوں وحشت میں پر ہی زادوں کے  
 شعر لے گئی ہیں قاف میں پر یاں میرے  
 شاعروں سے مری زینت ہے خدا شاہد ہے  
 میں تو انہی ہوں مگر ہیں وہ سخنداں میرے  
 پھر سنا اختر خوش لہجہ ذرا اپنی منزل  
 پھر چپک پھر چپک اے بلبل لبناں میرے  
 ۱۹ صفر ۱۲۶۳ ھ ہجری رات ۱۲ اختر اور مبارک الدولہ کی تسخیر  
 کا حال اور بادشاہ منزل کی تجویز سب معلوم ہوئی۔

محبت نامہ ششم

مالک اقلیم حسن و جمال فرمانروائے کشور محبت لازوال مشتری آسمان دہری



زمرہ فلک برتری، نہال خیابان، خوبی سرور جو بار محبوبی نواب شیدا بگم صاحبہ کو جس  
تحفہ گلہائے اشتیاق اور تمنائے موصلت کے معلوم ہو کہ خطا تمھارا اکیسویں تاریخ  
ماہ صفر کی معرفت مانتا اب الدولہ بہادر قریب پر دن چڑھے کے نور شیدا آسمانِ حصول  
اور شمس فلک وصول ہوا۔ مضامین مندرجہ اس کے از جزو تامل سب معلوم ہوئے  
اور جو تم نے لکھا تھا کہ ہم کسی کے بھر کالنے میں نہیں آتے ہیں میں بھی تم کو میدان  
محبت و الفت میں ثابت قدم جانتا ہوں اور یہی توقع ہے کہ ہر طرح ہمارا  
ساتھ دوگی اور مجھ کو تو ہر دم تم لوگوں کے رونگٹے رونگٹے کا خیال رہتا ہے۔  
اور شب و روز تمہاری ہی فکر رہتی ہے احتیاج لکھنے کی تو اس کو ہے کہ جس کو  
فکر نہ ہو۔ مرا حال تو خدا ہی پر روشن ہے اب خدا سے یہ امید ہے جلد تم  
سے ملا دے تا تمنائے دلی بر آوے۔ فقط ۳۱ صفر ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم۔

## محبت نامہ ہفتم

سرورِ حسینہ یا رخسارِ قرینہ نواب شیدا بگم صاحبہ سلامت رہو۔  
اٹھائیسویں تاریخ منشی صفدر کی معرفت خطا محبت نمط زخم ہجر کے لیے سوزش میں  
مرہم کا فور ہوا۔ مرض بیتیابی یک قلم دل سے دور ہوا۔ شمعِ شب کو جب روشن  
ہوتی ہے میں اپنے پرولنے کی یاد کرتا ہوں، چاند جب دکھائی دیتا ہے  
میں اپنے چکور کے لیے فریاد کرتا ہوں، باغ جب دیکھتا ہوں اپنا پھول  
ڈھونڈھتا ہوں، لالہ جب نظر آتا ہے ساتھ ہی اپنے داغ کسٹہ پر آنکھ  
پڑتی ہے، قمری جب سامنے آ جاتی ہے وہ سرورِ خراماں یاد آتا ہے اور جب



دیکھتا ہوں ہر ایک دیدہ تر منہ برساتا ہے ایام فراق بسر نہیں ہوتے ہیں۔  
 پیروں منہ ڈھانکے روتے ہیں چشمہ چشم سے ہر وقت آنسو جاری رہتے ہیں۔  
 یہ ہے کہ فراق مجنوناں میں اپنی جاں سے عاری ہیں اے فلک کیوں وہ  
 بھی کوئی دن ہوگا کہ ہم اور وہ یار یکجا بہم پہلو ہو کر بیٹھیں گے اے جان من جان عالم  
 پر جدائی تمھاری نہایت دشوار ہے اپنی جان سے بزار ہے الہی ہمارا یا رسم سے  
 پھر ملے سینہ سے سینہ سر سے سر ملے اور اب تو هذا فراق بینی و ببینہ کی گفتار  
 ہے لب پر آہ شر بار ہے دسوزی سے تنگ آئے ہیں کیا کیا کھلتے ہیں آن کر  
 پچھتائے ہیں خدا تمہیں آباد رکھے کہ تمھارے یاد کرنے سے زلیست ہے نہیں تو  
 کب کے رو براہ ہو گئے ہوتے، مصرعہ الہی یاد وصل پر ہی ہو... ہو سزاوار ہے  
 فراق نہیں ہے، بر بھی ایک جگر کے پار ہے، حق سبحانہ تعالیٰ جلد اس بلائے جانگاہ  
 سے نجات دے تو زندگی ہو جائے گو یاد دوبارہ آب حیات دے، اے مولیٰ۔  
 ایک خط بھائی نے لندن سے بھیجا سوائے رسید اور اس میں کچھ تحریر نہ تھا اس  
 واسطے اتنا ہی قلم بند کیا۔ امید اب ستودہ صفات سے تمھارے یہ ہے کہ مدام  
 نگارش حال سے اس مجبور بلا نصیب کو سرفراز کیا کرنا۔ دور از مخلص نوازی نہوگا  
 رقم زدہ ۲۸ صفر ۱۲۷۳ ہجری راتم غریب الوطن جان عالم۔ اور غزل تمھاری  
 ہمیں پہنچی سند کے لئے مطلع کا مصرعہ اول لکھتا ہوں سے ہجر میں تائے گنا کرتی ہوں بھر  
 اور میں تمہیں خطا متواتر بھیجتا ہوں۔

محبت نامہ ششم

مربان عاشقہ والہ و شیفتہ نواب شیدا بیگم صاحبہ سلامت رہو تیر ہویں تار تار



کتاب الدولہ ہادر کی معرفت نمیقہ مسرت و ثقیقہ عین انتظار میں افسر فرق منتظر  
 ہو اخط کا دل میں گھر ہوا۔ اسے ہر سہر خوبی عجب بلا میں مبتلا ہیں کچھ بس نہیں  
 امیدوار رحمت خدا ہیں۔ آج کل کب انتہائی ملال نہیں کوئی گھڑی ہے جس میں  
 تمنائے وصال نہیں۔ خدا ایاں فراق و مصیبت جلد کاٹے دشمن اپنا تھکے کا  
 آپ چائے ایک تحفظ غم یار جانی فراموش نہیں بندہ بارالہفت سے الی الاکان  
 سبکدوش نہیں، برتری ہماری سب خاک میں مل گئی ایک ایک بڑی درد فرقت  
 سے مل گئی۔ صالح ازل نے ہماری تصویر انھیں صدمات کے لیے صفحہ دنیا  
 پر خلق کی تھی کیا، انھیں مصائب کے لیے سلطنت دی تھی۔ اے میری معشوقہ  
 امید وصل منقطع ہے قیدیوں کی طرح میری قطع ہے دائرہ برہمی بال پریشان  
 دیدے تیرے جانب دیوار و درنگراں انصاف خدا کے ہاتھ غیر کف کا ساتھ  
 ہے برسوں جو خاص مکان سے نہ نکلتے ہوں وہ سدر بن کے جنگل میں بردوان  
 کی کوٹھی میں مقیم ہوں۔ اس سے زیادہ اور کیا عذاب عظیم ہوں۔ ماہ تاباں  
 دیکھنے نہیں پاتا ستاروں سے آنکھیں نہیں ملتا۔ چہرہ امید نے منہ چھپایا  
 جو نہ دیکھا تھا وہ دکھایا مگر اب تک وہی جو روح بھا ہے اب تک نجات ہم سے خفا  
 ہے شمع بال شمع نہیں کون ساعت ہے جو شور و شین نہیں۔ فاما تم آہا تم آہا  
 کیا کیا نہ تڑپے کیا کیا نہ دل کڑھا۔ امید ہے کہ اس بے بالی پر یعنی بے نور  
 راختر کو جب تک دم میں دم اس کے باقی ہے نہ بھولنا۔ نقطہ۔

رقم زدہ ربيع الاول ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم  
 رٹ کی تو تم سے تولد ہو چکی مگر مسہری عنقریب نکلی آتی ہے یا مل گئی ہو۔ غور و محمل



کو بھی لکھ چکا ہوں اندر کئی ٹھکانے بھی اچکا ہوں اگر میری طرف سے اس کے دینے میں دریغ ہو تو لعنت خدا مجھ پر۔

## محبت نامہ نم

پیارے شیدائے عالم کو معلوم ہو درختے تمہارے بھیجے ہوئے ایک میں طلبِ نسخہ شفاء ہم سے اور دوسرے میں ایک غزل اور احوال غلامِ حسین علی خاں درج تھا، کنز الدولہ بہادر کی معرفت جو تھی تاریخ ماہِ حال کی ہمیں پہنچے جانمن جو وہائیاں تم نے کبھی ہیں وہ تو اب عنقا صفت ہو گئی ہیں۔ ہاں غنظلِ غم ہر جا موجود ہے اور غزل کی تعریف میں کیا لکھوں زبانِ ادائے وصف میں اس کے قاصر ہے اور تو کیا نذر کروں جانِ حاضر ہے مگر اسے ماہِ خوبی غلامِ حسین علی خاں کون ہیں جنہوں نے خواب دیکھا ہے اگر تمہارے باپ میں وہ فقط حسین علی خاں ہیں لفظ غلام شاید آداب لکھا ہو، بہر حال اس کی تصریح کر کے لکھنا۔ اور اب ہم بڑے صدقات اور آہوم میں گرفتار ہیں خارش اور چھٹے اور داد و دُمل اور دانوں کا نہایت زور ہے تمام بدن سرخ بابا رہتا ہے، ایک ایک دانہ میں سے پیپ اور ہو بہتا ہے لندن میں یہ حال ہے بھائی صاحب یہ چاہتے ہیں مجھے سلطنت ہو، صاحب زادے صاحب یہ چاہتے ہیں کہ مجھے ہو۔ چچا بھتیجے میں قرار واقعی جو تا پھیل رہا ہے ہم بیاں غلیل پڑے ہیں ہمیں کوئی نہیں پوچھنا خدا نخواستہ اگر وہاں ہی حال ہو تو کمپنی مجھے جیتا نہ چھوڑے گی خدا جانے کیا گت اور نوبت میری ہوگی۔ اب تو یہ مدعی قرار واقعی دشمن ہو چکے ہیں مگر اے گلِ خوبی افسوس رہا کہ تیری اور تیری لڑکی کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔ دوسرے یہ کہ رشکِ گل



نے آسمان جاہ پر کہ کسی طرح سے اس کو مجھ سے چھین لے، نالیش کی ہے۔ روز و کیل  
 آکر ناک میں دم کرتے ہیں اور مجھ سے کہتے ہیں کہ اپنے رُکے رشک محل کو حوالہ کر دو کوئی  
 میری فریاد نہیں سنتا۔ مجھ سے رُک کا کھیلے کا ٹکڑا نہیں دیا جاتا۔ باقی اور حال اگر سنو گی  
 سوائے ملال کیا بات آئے گا۔ اب ہمیں زندوں میں نہ سمجھنا ہم مردوں میں ہیں برس  
 چھ چھینے کے اور رہاں ہیں اسیر ہے کہ جب تک جیتا ہوں رُک نہ بھیجا کر نا فقط مر قوم  
 چارم ربیع الاول ۱۲۷۳ ہجری راقم بسمل جان عالم عاشق شیدا لے

## محبت نامہ دہم

یلائے عراق خوبی سلمائے حجاز محبوبی طوطی چین موانست است لبیب گلشن موافقت  
 خلاق ناز، موجد عشوہ و انداز، حور پر ہی پیکر آفتاب صبح شمس، بلقیس شمت، زلیخا صورت،  
 حذرا عذار، حور اکردار، برگزیدہ حسینیان عالم نواب شیدا، بیگم صاحبہ بالقاتے دورہ  
 شمس و قمر زیب پہلوئے اختر رہو۔ بعد شوق وصال لازوال اور آرزوئے مشاہدہ  
 جمال باکمال خاطر محبت ذخائر پر روشن اور مہرین ہو کہ نسیم عنبر نسیم بہشت وحدت  
 دگلستہ جہاں مودت یعنی نامہ نامی اور صحیفہ گرامی عین انتظار اور کمال انتشار

اپنی سلطنت کی واپسی کیلئے واجد علی شاہ نے لندن میں ایک مقدمہ دائر کیا تھا اور اس کے لئے ایک اپنے  
 رکیل اپنے بھائی "ایک بیٹے اور ماں کو بھی بھیجا تھا۔ قریباً کہ مقدمہ کامیاب ہو کر مٹیا رُج میں اعلیٰ  
 کے ہوا خواہوں نے عہدس کیا کہ اگر مقدمہ جیت گیا تو سارا عمل دخل اس کیل کا ہو جائے گا اور یہ لوگ اپنی ہوا کو بھروسے  
 چنانچہ واجد علی شاہ کو سمجھا یا کہ وہاں لندن میں آپ کے بھائی اور بیٹے خود اپنے حصول سلطنت کی کوشش میں ہیں آپ مقدمہ  
 واپس لے لیجئے واجد علی شاہ کی سمجھ میں آگیا اور مقدمہ کی واپسی کی درخواست بھیج دی اس خط میں سی غلط فہمی کا ذکر ہے۔  
 تفصیل کیلئے دیکھئے "گزشتہ مکتوب" مصنف شرر مرحوم۔ (نور اکمن)



میں مع غزل کہ مصرع مطلع اس کا یہ ہے خدا کے فضل سے ہے وہ بہار..... پر،  
 چھٹی تاریخ ربیع الاول کی معرفت آفتاب الدولہ بہادر کے فوت بخشنے والا دماغ و جان  
 کا اور طاقت دینے والا دل ناواں کا ہوا۔ شکایت ربیع فراق دیکھ کر غم دوری دو بالا ہوا  
 کیفیت بیکاری بڑھ کر زخم دل آلا ہوا۔ اپنے بولنے کے باب میں جو اشارہ کیا تھا، حل یہ  
 ہے کہ میرا بھی دیکھنے کو جی چاہتا تھا مگر کیا کروں بہت سے موانع ہیں کہ بولانہیں سکتا۔  
 خدا سے یہی دعا کر دکھم کہ ہمارا دم سے ملا دے تا سب گدورتیں دفع ہوویں، مطلب  
 دلی برآمدے فقط مرقوم ہفتہ ربیع الاول ۱۲۳۵ھ زاتم جان عالم آخر

## محبت نامہ یازدہم

جان من جانان من ذاب شیدا بگم صاحبہ پوچھو، ساتویں تاریخ ماہ حال کی شتیاق  
 نامہ خیر ختامہ کنز الدولہ بہادر کی معرفت غازیہ کش چہرہ امید اختر ہوا سب حال معلوم ہوا۔  
 فی الواقعی الیالم ہجر تو نصیب دشمنان بھی نہ ہو جو ہمیں تمہیں نصیب ہوا۔ خدا شاہد حال  
 ہے کہ دوری مارے ڈالتی ہے تقدیر اپنی ہوس کس کس طرح نکالتی ہے۔ اے ماہ دو ہفتہ  
 رد کش ہلال تجھ بن سچ سونی ہے۔ جب غور کر کے ایک ایک آنکھ سے دیکھو مصیبت و دنی  
 ہے جنیاں میری شیدا خواب کا حال سب دریافت ہوا، ہم مرد لوگ ہیں ہمیں اس میں  
 کچھ ذرا دخل نہیں۔ والدہ صاحبہ آگاہ ہیں سو وہ ہزار دن کو مس دور لندن میں ہیں ہم مجبور  
 ہیں مگر یقین ہے کہ اگر غور و محمل یا تشاؤ محمل سے پوچھو تو کیا عجب ہے کہ انہیں اس میں تمیز  
 اور یاد ہوا ہم نے تو یہ ٹوٹکے اور غمتیں آج ہی تمہاری تحریر میں دیکھیں۔ بہر حال جو کچھ ہو  
 دیرینہ آدمیوں سے دریافت کر کے کار بند ہونا۔ مسری بھی یقین ہے کہ پہنچ چکی ہو یا اب



پہنچ جائے گو کارندے لیت دھل کرتے ہیں۔ مگر کیا ہوا فیل چہرہ ہی مسہری انشا اللہ تمہارے پاس ہوگی مگر جان من وہ ایک ہی مسہری میری ہے تمہارے واسطے اور تمہاری لڑکی کے واسطے، جان تک عزیز نہیں، آج اگر برسر حکومت ہوتے تو خدا جانے کیا کیا نہ کچھ حوصلے نکالے ہوتے۔ لکھنؤ بھر کے فقیر سب روپے دلے ہوتے، تقدیر میں کسی کو دخل نہیں جو مرضی خدا اب ہر طرح اپنے دل کو لباش رکھنا۔ فقیر کیا خوشی خرمی نہیں کرتے مثل مشہور ہے جتنا اوڑھنا اتنا پاؤں پھیلا نا۔ ہم تو ابھی فضل الہی سے مالدار ہیں اور رہیں گے تم کچھ اس کا تردد نہ کرنا۔ مناسب یہ ہے کہ اسی طرح ارقام خطوط سے مسرور کیا کر دو۔ فقط۔ رقم زدہ ربیع الاول ۱۲۷۳ھ راقم پرالم جان عالم

## محبت نامہ وازویم

عاشقہ والہ شیفۃ شیدا بگیم صاحبہ بہت سلامت رہو۔ گیارہویں تاریخ ماہ حال بد ہدفرخندہ قال یعنی خبر فرحت اثر تولد شائندہ دی نامدار تاریخ شہر صدر کی بمعانہ عرضداشت برادر عزیز القدر حسام الدلہ بہادر گوش زد آخر ہوئی، گو مسافر میں ہیں مگر خوشی سے پیرہن میں نہ سمائے ہم نے بر خود ارطو عمر ہا کا خطاب نگین آرا نواب رقیہ بانو بگیم صاحبہ عنایت کیا حق سبحانہ و تعالیٰ مبارک و مسعود کرے اور یمن قدم سے اس نونال باغی سلطنت کے استرادیلک موردی ہمارا بوجہ احسن جلد تر ہو۔ جاتین موافق بر خودار سریر آرا نواب زینب سلیم صاحبہ اور تحت آرا نواب شہر بانو بگیم صاحبہ عالی الشہر ہا کے اس نور چشم کی بھی ماہواری تنخواہ اتنی ہی مقرر کردی اور حکمانہ بھی دبیر الہ دلہ بہادر کے نام پر اس مضمون کا بھیجا ہے خلط مجوبہ



قرین اطمینان رہے اور ہماری طرف سے بر خودار موصوفہ کی دیدہ بوسی کرنا۔ فقط۔  
 رقم زدہ یا زدم رقم زنج الاول ۱۲۴۳ھ راقم جان عالم۔

## محبت نامہ سیر و ہم

نواب شیدا بگم صاحبہ سلامت رہو۔ گیارہویں تاریخ آفتاب الدولہ ہباد  
 کی معرفت خط ہمارا آیا۔ آنیہ کو ایسی عبارت میں گنجلک پڑ گئی تھی کہ وہ فقرہ مبارک اللہ  
 والا میری سمجھ میں نہ آیا اور غزل بھی پہنچی جس کا مطلع کا مصرع یاد دہی کے واسطے  
 لکھتا ہوں یہ نہ ہوا اگر ترے عارض کا نظارہ ہے اور اگر بادشاہ منزل میں  
 نہ جی اپنے مکان میں جی خوب کیا اور کوئی امر تو ایسا نہ تھا جس کا مطلب ہمتاوی  
 سمجھ میں نہ آیا اور نہ نقل اس خط کی میرے پاس ہے فقط رقم زدہ ۱۲۴۳ھ  
 راقم انتم (جان عالم) مجبور

## محبت نامہ چہار دم

رواق کی مسند کی بیٹھنے والی نواب شیدا بگم صاحبہ سلامت رہو۔ نپہ ہوں  
 تاریخ منشی صفدر کی معرفت گلدستہ بارغ عشق نے خط مسرت منط آیا۔ رنگ دنا  
 خوب چمکایا۔ داغہائے فراق کا مرہم ہوا۔ غم دوری اس کے دیکھنے سے کچھ کم ہوا۔ جان من  
 سبحان الشریس اسی طرح ہمیں یاد کیا کرد۔ اجوار رسم خطوط سے دل غم دیدہ جان عالم  
 شاد کیا کرد۔ خدا اس کا اجر کامل دے گا۔ اور زنجیریں محرم کی آئیں کھلیں ہم نے  
 کسی کی بھیجی ہوئی نہیں ہیں۔ منت مانی ہے کہ لکھنؤ میں آکر سب کے ہاتھوں سے



پہنوں گا۔ اور جان من حسام الدلہ بہادر اور محمد محبوب علی خاں، نواب ناظر بہادر اور  
 لاگوں کے خطوط اور عرضداشتوں سے نظر مبارک سے گزرا کہ تم سے شاہزادی تولد  
 ہوئی تیسری تاریخ اس مہینے کی اور عجب در عجب کہ تم ساتویں تاریخ کا خط لکھتی ہو اور  
 کوئی اشارہ اور ایسا اس امر کا نہیں پایا جاتا۔ مجھے خفتان ہوتا ہے یہ کیا معامہ ہے  
 لازم ہے کہ جو حال واقعی ہو جلد لکھو فقط رقم زدہ پانزدہم ذیح الاول ۱۲۴۳ھ  
 راقم جان عالم

### محبت نامہ پانزدہم

گلرخا نواب شیدا بیگم صاحبہ سلامت رہو۔ انیسویں تاریخ اس مہینے کی کپتان کنز الدلہ  
 بہادر کی معرفت خط مسرت منط مشتمل بر اظہار حال اشتیاق اور شرح سوز فراق مع  
 قطعہ نو طرز مرصع جس کے شعر کا مصرعہ ادل سند کے لیے لکھتا ہوں سے فیض جاری  
 رہے مدام تیرا۔ عین انتظار میں داروئے مرض ہجر ہوا۔ عجب ہے کسی خط میں حال  
 مزاج نور چشمی نکلین آرا نواب رقیہ بانو بیگم صاحبہ نہیں لکھتی ہو۔ یہ کیا معاملہ ہے مناسب  
 کہ جب خط لکھا کرو ضرور بالضرور لڑکی کے مزاج کا حال بھی لکھا کرو۔ ہمیں تردد رہا کرتا ہے  
 یا شاید میری نشانی کی محبت سے تم کو اس بچی سے بھی رشک محل کی طرح نفرت ہو گئی ہو،  
 سو اس کے اور کیا لکھوں کیا وجہ جو اس کا حال نہیں لکھتیں۔ باقی یہاں سب طرح فضل الہی  
 ہے۔ چاہے سہل میرے ہو چکے۔ ابھی عارضہ خارش میں افاقہ نہیں امید ہے کہ اسے  
 نامہ لکھا کرو۔ رقم زدہ سبت دہم ذیح الاول ۱۲۴۳ھ راقم جان عالم۔ یہ خط  
 لکھ چکا تھا کہ اسی وقت ایک خط اور آفتاب الدلہ بہادر نے لا کر دیا۔ اس میں شرح



سوز فراق تھی۔ اور خط نسخہ امر کا جواب تھا کہ لوگ کہیں گے کہ میا سے ایک مریض اچھا نہ ہو سکا۔ جان من امراض سوداوی کے علاج میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ برسوں کے بعد مریض شفا پاتے ہیں۔ یہاں تو ابھی برس دن بھی نہیں ہوا۔ جواب کی سند پہنچی، ذہن ہمارا ٹھیک تھا اور ٹوپی جو مانگتی ہو۔ میں اس رمز کو سمجھا کہ نقاش نقش ثانی بہتر کشناط حوص کی تو کیا ملکہ سیستم کی برابری اب سب صاف کرتے ہیں پہلے سے کسی کو نہ ہماری ٹوپی کا خیال آیا نہ انگر کھے کا نہ پانچانے کا۔ اب فضل اکھی سے تم بھی بے چین ہو اور نواب نور زماں بیگم صاحبہ جنہوں نے خط پھیر دیا تھا، وہ بھی اسی امر کی طالب ہیں۔ تم صاحب لوگ یہ نہیں سمجھتی کہ دل کی بات اور بناوٹ میں زمین آسمان کا فرق ہے اور اب میں فقیر ہوں آگے سلطان تھا۔ کلاہ فقیر لے کر کیا پاؤں گی۔ بے سلطنت لئے ارادہ میرا لکھنؤ میں آنے کا نہیں ہے۔ ہاں اگر سلطنت نصیب ہوئی تو وصل بھی تم لوگوں کا ہو گا اور نہیں تو مجھے رکاوٹ سے کیا حاصل ہے میں آپ کسی کے گھر بیٹھ جاؤ گا۔ اور عجب ہے کہ اس دوسرے خط میں بھی کچھ لڑکی کے مزاج کا حال نہ لکھا حیف ہے! خیر!

## محبت نامہ شانزدہم

دلدار نواب شیدا بیگم صاحبہ رجان عالم کی طرف سے معلوم ہو چو تھی تاریخ اس صیف کی فتنی صفحہ کی معرفت خط فرحت منط آیا۔ غزل بھی جس کے مطلع کا مصرع مند کے لیے لکھا ہوں سے یا تو وہ رہتے تھے پہلو میں ہمارے اختر۔ مع شرح داستان اشتیاق اور مسہری کا ملنا اور لطف وصل اس مسہری کو دیکھ کر یاد آنا اور اظہار حال علالت مزاج



اور طلب اجازت آمد حکیم بنار بنّا، اور امنوس کرنا ہمارے حال عارضہ پر اور قصد کرنا  
 تمھارے والد کا اس طرف کو شرح اور مفصل سب ہم نے پڑھا، جان من میں نے چار  
 طبیب مقرر کر رکھے ہیں۔ شفاء الدولہ کے بھائی اور طبیب الدولہ کے بھائی اور حکیم  
 غلام علی اور حکیم الدولہ۔ اس میں سے جسے پسند کرو اس کا معالجہ کرو۔ نیا طبیب بلوانا  
 میرے نزدیک اچھا نہیں آگے محققین اختیار ہے اور تمھارے والد بنار بادشاہ  
 آنے کا قصد کریں میں اب فضل آئی سے اچھا ہوں۔ باقی چار مسلوں کے مجھے  
 فراغت ہو چکی۔ اب پرہیز بھی ٹوٹ چکا مگر خارش بدستور ہے، اور صدمات فراق  
 چند در چند ہیں جن کی شرح طول اور طویل ہے امید دار ہوں کہ لڑکی کے مزاج کی  
 خبر سے بھی مطلع کیا کر دیا وجہ جو اس کے مزاج کی خبر نہیں لکھتیں۔  
 مرقوم چہارم زیج الثانی ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم۔

## محبت نامہ مقدم

خوشنما ذاب شیدا محل صاحبہ، نگین آرا رقیہ بانو بگیم صاحبہ کی سرپرست صحت  
 اور تندرستی سے تاقیام قائم آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سلامت باکرامت رہو، اے میری  
 پیاری گوری گوری شیدا تیرا دل تیرا دل کو اس جیسے کی جمہ کے دن کیتان کنز الدولہ  
 بہادر کی معرفت خط بلبل سخن گلشن میں مثل ہد نایاں ہوا اسے پڑھ کر خوش دل و  
 جان ہوا۔ سرنامہ یہ غزل تھی جس کے مطلع کا مصرع ادل سند کے لئے لکھتا ہوں۔  
 گلوں میں پاتی ہوں میں جب شاہت جان عالم کی۔ اور باقی سب احوال من و عن  
 معلوم ہوا۔ تم نے جو لکھا کہ ہفتہ بھر گزرا کوئی تشفی نامہ تمھارا مجھ تک نہیں پہنچا، جانی



قسم قرآن کی کوئی خطا متھارا ایسا نہیں جس کا جواب نہ لکھتا ہوں، یوں ڈاکیوں کا  
 قصہ ہو گا کہ راہ میں ڈال رکھتے ہوں گے، اور چار سہل ہو چکے اب خارش بھی کم ہے  
 خاطر جمع رکھو اور اشارہ غزل کیا کہنا جس سے جی چاہا کہلو اے بھجوائی اپنے  
 ادب و مہر دانی۔ اور مسافرین لہرن کا جو حال تم نے لکھا ہے یہ خبر نہیں معلوم جب  
 ہم تک یہ خبر آئے گی اسی وقت کہلا بھیجیں گے اور سب فضل الہی ہے اسی طرح خط  
 لکھا کرو۔ نقطہ مرقومہ سیر دم ریح الثانیہ ۱۲۷۳ھ ہجری راقم جان عالم۔ لڑکی کو  
 ہماری طرف سے دعا کہ دینا۔

## محبت نامہ ہشتم

محل گلزار متناذرات شیدا محل صاحبہ سلامت رہو۔ چودھویں تاریخ اس ہینے کی  
 کپتان کنزالدولہ بہادر کی معرفت نامہ عنبریں شامہ فرحت بخش کا نشانہ امید ہوا۔ میرزا  
 اس وقت قابل دید ہوا۔ برخوردار نگین آرا نواب رقیہ بیگم صاحبہ کا اندر تہاری محبت  
 اور تندرستی کا حال پڑھ کر نہایت دل خوش ہوا۔ حق سبحانہ تعالیٰ سے ہمارے تمھارے  
 سامنے میں صبح و سالم رکھے، جان من فضل الہی سے اب میرا مزاج بھی اچھا ہے تمہے  
 پھر لموں یہی متنا ہے۔ مرقومہ چار دم ریح الثانیہ ۱۲۷۳ھ راقم جان عالم۔

## محبت نامہ نوزدہم

ذی حوصلہ یار خوشنا نواب شیدا محل صاحبہ سلامت رہو۔ بیسویں تاریخ اس  
 ہینے کی دو قطعہ نسیقہ مسرت و شیفہ ایک طولانی مشتمل بر عذر شکوہ مثالیہ رشک محل اور



تو پی نہ بھیجنے کا کہتا ان کنز الدلہ کی معرفت اور دوسرا مختصر متضمن ملال عدم نوشت خط  
 اس طرف سے فشی صفدر کی دسات سے پہنچے۔ جان من ہم کو خدا کی قسم کوئی رقم  
 تمہارا ایسا نہیں جس کا جواب نہ دیکھتے ہوں یا قلم انداز کرتے ہوں مگر اثنائے راہ میں  
 ڈاکوں کم بختوں کے ہاتھ سے جو ڈاکہ پڑے اور تلف ہو جائیں اس کا کیا چارہ  
 اور دوسرے رقم کا جواب نہایت طویل ہے جناب باری تمہاری عفت اور عصمت  
 کا کفیل ہے۔ سنو پیاری کوئی کسی کے دل کے اندر نہیں بیٹھا ہے خدا جانے تم نے کیا  
 لکھا ہے جو آج تمہاری طبیعت ہم سے ہٹ جانے پر کون بنائے بہر حال خدا نے  
 لایزال ہمیں معشوق اور تمہیں عاشق بنا رکھے ہماری محبت کے حال کو تم پر فائق بنا رکھو  
 جس قدر تمہیں الفت ہوگی اسی قدر بیاں بھی دل کو اثر ہوگا۔ تم لکھتی ہو کہ مجھے جھوٹی  
 باتیں نہیں بنا آتی ہیں تمہیں انصاف سے جواب دو کہ آگے تمہارے اس قدر رقم  
 آیا کرتے تھے جس قدر اب آتے ہیں۔ آگے تو اتنے نہ آتے تھے اور تمہاری لڑکی کے  
 علاج کو صحت الدلہ کو حکم بھی دیا۔ لڑکی کی عرضی بھی پہنچی۔ ۲۰ ربیع الثانیہ ۱۲۷۳ھ  
 راقم جان عالم

## محبت نامہ مستم

حور تماشاں پر ہی جمال قمر طلعت آفتاب صورت، تاب گیسوئے خوبی، مشک نافہ محبوبی  
 آہمے ختن دہری، غزال چین سروری، دلدار، دنا شمار شیریں گفتار، کبک رفتار نازک  
 بدن یا سمن تن لیلی ناز، عذرا انداز نواب شدا بیگم صاحبہ کو جان عالم تصور میں گلے لگا کر  
 پیار کر کر یہ کہتا ہے اور گل تقریر اس طرح مکتا ہے۔ عزہ جمادی الاولیٰ کو چکیدہ خام



کرشمہ نگار یعنی نامہ عنبر بار تھا رانسی صفدر کی معرفت پہنچا۔ غم دور ہوا۔ عاشق دور افتادہ  
بہت مسرور ہوا۔

من از ترانہ این تازہ نغمہ بشگفتم  
چو لب زخندہ و جام از شراب گل ز بہار

حال مندرجہ اس کا کھلا خیر و خیر و عافیت سنکر غنچہ خاطر نسیم مسرت سے کھلا طیبیوں کے  
مقرر کرنے میں تم کو اختیار ہے ملازموں سے جو مزاج داں ہوا اور تمہارا اس نے اکثر  
علاج کیا ہوا اس کو علاج کے واسطے محمد محبوب علی خاں ناظر سے کہہ کر بلو ابھیجو کوئی عذر  
نہیں کرے گا جس سے کہو گی بجان و دل قبول کرے گا اپنے والد کو جو منافقت کی بہت  
اچھا کیا خدا سے دعا مانگیں کہ ہم جلد منظر و منصو وہاں آ دیں جس طرح سے جی چاہتا ہے  
اس طرح دیکھیں۔ برخور دار نواب نگین آرا بیگم کو ہماری طرف سے دعلیچے زیادہ شوق  
وصل لکھنے میں بہت طول ہے۔ راقم زدہ غرہ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۳ راقم جان عالم۔  
اور ہم نے سنا کہ تمہارے مکان سکونت میں آسیب کا خدشہ ہے اور وہ مکان اچھا نہیں ہے  
لہذا تم اور کسی مکان کو تجویز کر کے کھے بھیجو تا وہاں جانے کا حکم ہو اور ہمارا تردد اور خفقان  
جاتا رہے۔

## محبت نامہ نسبت و حکم

مرج نقش اتحاد موجد مثلث و داد پری خصال مرتمثال رنگین ادا بت بادشا  
نواب شیدا بیگم صاحبہ کو جان عالم غریب الدیار کی طرف سے معلوم ہو چھٹی تاریخ جمادی الاول  
کو دو قطع خط تمہارے ایک معرفت کنز الدولہ بہادر کے اور دوسرا منشی صفدر کے ہمارے



پاس پہنچے دریافت خیر و عافیت مزاج سے اطمینان ہوا۔ مگر حال نحوست مکان کا شکر  
 نہایت خفقان ہوا۔ بجز دو دیکھنے اس مضمون کے حکیمانہ واسطے تبدیلی مکان کے حمام المدینہ  
 بہادر کے نام پر بھیجا ہے حسب الحکم بہادر ممدوح عمل میں لائیں گے۔ اپنا حال کیا تحریر  
 کروں فلک جفا کار کی شکایت کہاں تک تسطیر کروں، ہر روز تازہ الم ہے، نیا  
 غم ہے۔ دریں واسطے کرنا نواب ملکہ سردسہی کا گلشن ایجاد سے طرف باغ جانا قیامت  
 سے کم نہیں و فور ملال ہے اس دن سے طبیعت کا ایک عالم نہیں، کبھی صفت امیر زار  
 زار و تاجوں کبھی بستر بقیارہی پر عالم تنہائی میں منہ .....

## محبت نامہ نسبت و ششم

سراپا ناز خوش ادا نواب شیدا بگیم صاحبہ سلامت رہو۔ تیسویں تاریخ اس  
 پہنچنے کی دو قطعہ خط مسرت غلط آئے جو ہر شیر الفت چمکائے ایک خط کے سر پر یہ غزل تھی  
 جس کے مطلع کا مصرع یادداشت کے لیے اور پتے کے واسطے لکھا ہوں وہ یہ ہے  
 کرے دماغ فلک سے دل حزیں اختر۔ الی آخرہ تھی اور دوسرا رقم مختصر لکھا۔  
 کنز الدولہ بہادر نے لا کر دیئے ساغر الفت ہم نے ان دونوں خطوں سے پہنچے۔  
 جان من تم نے جو یہ شکوہ لکھا ہے کہ ایک خط میں میرے دو خطوں کی رسید دیتے ہو سنو  
 جان من بات ایک ہی ہے کار بیکاراں سے تم جانتی ہو مجھے ہمیشہ نفرت ہے صاف  
 صاف راست گوئی کی عادت ہے بنادت کر نہیں آتی ہے۔ بہت لگاوت سے  
 طبیعت گھبراتی ہے تم سانہیں ہوں کہ خواہ نہ خواہ کھوں ایک ہی مضمون کو چھاپے کی طرح



دو جگہ چھاپ دوں اور تم فضل آہی سے میرے مزاج سے ماہر ہو افسوس ہے کہ بے اعتنائی  
کا طعنہ ہو دو۔ دیکھو تو ہم کس آفت میں مبتلا ہیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں سے جدا ہیں ہمیں  
دن رات نہیں سو جیتے۔ طبیعت آرائی تو حلیش اور سرور میں حاصل ہوتی ہے۔ یہاں  
ہر وقت نیش فرقت خلش زن ہے۔ لڑکی کو دے لپٹے۔ رقم زدہ جان عالم مر قوسہ  
۲۳ جمادی الاول ۱۲۴۳ھ

## محبت نامہ نسبت و ہم

روح رواں من خوش ادا ذاب شیدا محل صاحبہ سلامت رہو۔ عوار رفعت  
سرا پا زاکت رہو۔ انیسویں تاریخ اس مہینے کی جلا دل کے نگینے کی یعنی ایک قطعہ خط  
فرحت منط فشی صنفہ کی معرفت وحی صفت آیا رنگ موافقت چمکا یا۔ جان من عجیب  
دغریب نسخہ طلب کیا تھا۔ سودے حیرانی سردست ہم کو دیا تھا۔ عجب دوائیں تھیں کہ  
بہت ڈھونڈا۔

## محبت نامہ نسبت و ہشتم

..... رقمہ نگار جان عالم زار مر قوسہ جمادی الثانی ۱۲۴۳ھ ہجری

## محبت نامہ نسبت و نهم

نذار دکو تہی در هیچ حال انسانیہ معاشق  
نغاں گر لب فرد بند دمتنا گفتگو دارد



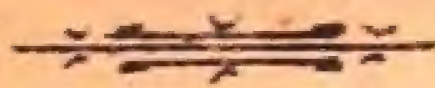
اے میری پیاری شیدا بیگم جان عالم پُرالم تم سے اُس خوشی کو کیونکر بیان  
 میں لاسکتے جو کسی کے قیاس میں نہ آسکے۔ تین خطا تمہارے دل و جان و جگر سے  
 پہلے ۸۔ حجابی الثانی کو منشی صفدر کی معرفت ایک دن آئے اور تو کیا کہوں وصل  
 کے مزے اٹھائے، سو سو دفعہ پڑھا۔ مکتوب وصل را دم از شوق بچو طفل صد بار خواندہ  
 و دراز سرگرفتہ است۔ دالشر کیا فقرے دلفریب تھے کہ جن کو پڑھ کر ہم ہاشکب تھو  
 ساری تمہاری صوت دیکھش آنکھوں میں پھر گئی تصویر غم طاق چشم سے صورت اشک گر گئی  
 صبر جاگزین دل پاش پاش ہوا جی نہایت لبشاش ہوا۔ خط کیا پڑھا گو یا تم سے دد بدو  
 باتیں کیں، سفیدی کا غزنے آسان ہجر کی راتیں کیں، دو نامے زرد تھے، یا میر عجم  
 مٹانے کو دونوں وحید و فرد تھے۔ اسی طرح ہمیشہ اپنی تحریر حالات سے تا مراجعت  
 ہماری شاد کیا کرد، اور ہم کو رنج تنہائی سے آزاد کیا کرد۔ فقط نامہ نگار  
 جان عالم زار۔ مرقومہ حجابی الثانی ۱۲۷۳ھ

## محبت نامہ سی ام

محکم امتحان، نوجوان، خوش ادا نواب شیدا محل صاحبہ۔ باغ عالم میں ہری بھری  
 رہو باخوشی اور خورمی رہو۔ نامہ عینریں شامہ نویں تاریخ اس مہینے کی جیسے ڈانک الماس  
 کے نگینے کی منشی صفدر کی معرفت بہار صفت آیا صبح کو آنکھ کھلتے ہی نقش مراد دکھایا۔  
 جان من مکان کی ناپائداری کا حال پڑھ کر ملال ہوا دل شکستہ تو تھا ہی اور بھی ٹوٹ گیا  
 بیخ کمال ہوا واقعی شرف المکان بالمکین ہوتا ہے بے باغباں باغ درست نہیں ہوتا ہی  
 اے مایہ عیش.....



# علم عروض صوتی اعتبار سے



[علم عروض ہمارے طلباء اور اکثر شعرا کے لئے درد سر کا باعث رہا ہے۔ اس  
 کے قواعد اور اصول تقریباً علم ریاضی کے اصول پر ہوتے ہیں۔ اور ریاضی  
 سے شعرا اور ذہین طلباء عموماً گھبراتے ہیں اسی لئے علم عروض کی طرف توجہ نہیں  
 دے پاتے۔ شوقندہ بنا سہ سے بہتر کہتے ہیں مگر فاعلاتن فاعلات کی وجہ سے  
 چکر لگاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے قواعد کچھ پیچیدہ ہیں لیکن اگر ذرا  
 توجہ دی جائے تو سب حل ہو جاتے ہیں، دراصل علم عروض کا تعلق آواز سے  
 ہے نہ کہ تحریر سے، آوازوں ہی کو ترتیب دینے کا نام علم عروض ہے۔ شعر  
 میں نغمہ درحقیقت اسی آواز کی ترتیب سے پیدا ہوتا ہے۔ گو یا علم عروض  
 ایک واسطہ ہے شعر کا علم موسیقی سے۔ موسیقیت اشعار میں پیدا نہیں ہو سکتی  
 جب تک ان میں آواز کا ترنم کسی خاص صوتی ترتیب کے ماتحت نہ ہو۔  
 ہمارے عروضیوں نے علم عروض کے سلسلے میں یہ بات تو تسلیم کی کہ ملفوظی الفاظ  
 لائق اعتبار سمجھے جائیں گے اور مکتوبی نہیں۔ لیکن انہوں نے تلفظ کو واضح کرنے  
 کے لئے اور آوازوں کی حرکت اور سکون کو تمیز کرنے کے لئے الفاظ اور  
 ارکان کی جو قسمیں اور اصطلاحیں وضع کیں ان سے بڑی پیچیدگیاں پڑ گئیں



اور یہ علم بہت دشوار ہو گیا۔ اگر ملفوظی حرکات کو صوتی شکلوں میں پیش کیا جاتا تو اتنی زیادہ دقت نہ پیش آتی لیکن غالباً اس دقت یہ ممکن نہ تھا۔ اس مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ صوتی لحاظ سے عروض کو پیش کیا جائے اس میں انگریزی ادبیات کے علم عروض سے بھی مدد لی گئی ہے اور طلباء پر تجربہ کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ اگر علم عروض کو اس طریقہ پر ان کے سامنے پیش کیا جائے تو وہ بہت جلد اسے سمجھ جاتے ہیں۔

آخر میں یہ بات اور عرض کرتی ہے کہ اگرچہ علم عروض کو یہاں صوتی انداز سے پیش کیا گیا ہے لیکن ارکان اور بحر و زحافات کے نام دیے رکھے ہیں جو ہمارے یہاں اب تک رائج ہیں کسی اصلاح کی کوشش فی الحال نہیں کی گئی ہے اور زیادہ تر وہی بحر و زحافات پیش کئے گئے ہیں جو ہماری اردو شعرو شاعری میں عموماً مستعمل ہیں۔

اردو علم عروض ہو یا انگریزی دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ وہی الفاظ لائق اعتبار سمجھے جاتے ہیں یعنی تقطیع میں لائے جاتے ہیں، جو زبان سے ادا ہوں اور تلفظ میں آئیں وہ نہیں جو صرف تحریر میں آئیں یہ الفاظ دیگر آواز پر توجہ دی جاتی ہے نہ کہ تحریر پر۔ آوازیں عموماً دو طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جو ہماری زبان یا نکلے سے مفصل اور مکمل نکلے اور دوسری وہ جو مختصر یا نامکمل نکلے، مثلاً فقرہ ”آگیا“ کو اگر ہم پڑھیں تو منہ سے لفظ ”آ“ تو پورا اور مکمل نکلے گا ”گ“ مختصر اور پھر ”یا“ مکمل۔ اسی طرح لفظ ”تاشا“ اگر منہ سے نکالیں تو ”ت“ مختصر طور پر یا ادھوا ادا ہوگا ”ا“ اور ”شا“ پورے طور پر ادا ہوں گے، اسی طرح ہر لفظ یا فقرہ مشتمل



ہوتا ہے۔ مکمل یا مختصر یا پوری یا ادھوری آوازوں پر۔ اب اگر ہم مکمل آواز کے لئے نشان (د) مقرر کر دیں اور مختصر آواز کے لئے نشان (۸)، تو فقرہ "آگیا" کی شکل یہ ہوگی (د-۸-) اور لفظ "تاشا" اس طور پر ظاہر کیا جاسکے گا (۸- - -) وغیرہ وغیرہ ہماری زبان میں ایک طرح کے الفاظ اور ہوتے ہیں یعنی وہ جن کا آخری حرف ساکن ہوتا ہے مثلاً خیال، گلزار، جہاں، کہیں، نہیں وغیرہ۔ ان سب میں آخر کا حرف ساکن ہے۔ ایسے حرف کے لئے ہم نشان (۲) مقرر کئے دیتے ہیں تو گویا الفاظ کے اعتبار سے تین طرح کی شکلیں ہوں گی (۱) مکمل (۲) مختصر یا نامکمل (۳) ساکن۔ جن کی شکلیں علی الترتیب یہ ہیں (د-)، (۸-)، (۲-)۔ اب اگر کسی مصرع کی صوتی شکل پیش کرنا چاہیں تو اس دم کے نشانات سے بہ آسانی ظاہر کی جاسکتی ہے۔ مثلاً

مطرب خوش نوا بگو تازہ بہ تازہ نو بہ نو  
= مطرب بخشش، نوا بہ گو، تازہ بہ تازہ نو بہ نو،

= ۸ ۸ - - ۸ - ۸ - ۸ ۸ - ۸ ۸ - ۸ ۸ - ۸ ۸ -

اس مصرع میں لفظ "تازہ" کی کبھی ہونی شکل تو مکمل ہے لیکن "زہ" کا ٹکڑا زبان سے ادا کرنے میں دب کر نکلتا ہے، اس لئے اس کے لئے مختصر علامت دی گئی ہے یہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ آواز کی نوعیت ذہن میں رکھنی چاہیے نہ کہ تحریر کی نوعیت۔ لیکن الفاظ اور حروف کی نوعیت کس طرح ذہن میں رہے تاکہ شعر ٹھیک ٹھیک موزوں پڑھا جاسکے۔ اس کے کچھ قاعدے ہمارے عرصہ صیوں نے مقرر کر دیئے ہیں ان کو پیش نظر رکھنے سے یہ واضح ہو جائے گا کہ لکھے ہوئے حرف کو کس طرح ادا کیا جائے تاکہ ان کی آواز میں ٹھیک ٹھیک ادا ہوں اور ان کی







جیسے علم و ہنر و فضل و کسب و کمال میں تو شمار ہوگا، اگر واد کسی لفظ کے زبر و فتح سے محفوظ ہوگا جیسے سہ ہے قدر کسی کی تو وطن میں ہے دگر نہ میں۔ اس صورت میں بھی تقطیع میں شمار ہوگا۔

۶۔ حروف مخلوط :- جو ساتھ ملا کر بولے جائیں مثلاً کیا میں سے اور گھر میں سے۔ یہ شمار نہ ہوں گے بلکہ کا اور گز پڑھے جائیں گے۔

۷۔ ال :- عربی کا ال تقطیع میں داخل نہیں ہے مثلاً الشمس یا بالضرر میں کیونکہ ایسے ال پڑھنے میں نہیں آتے۔

۸۔ حروف ساکن :- اگر وسط مصرع میں دو ساکن ایک جگہ آجائیں تو پہلے ساکن کو قائم رکھتے ہیں اور دوسرے کو متحرک کر لیتے ہیں مثلاً خیر تو ہے آپ کہاں جاتے ہیں اس میں خیر کی سے تو برقرار رہی اور ر متحرک ہو جائے گی کیونکہ وہ پڑھنے میں واضح رہتی ہے۔

۹۔ اگر وسط شعر میں حرف ساکن دو سے زیادہ ہوں تو اول ساکن بحال رہے گا دوسرا متحرک ہو جائے گا تیسرا در کر دیا جائے گا۔ جیسے راست کتا ہوں اس کو پچ جاؤ اس میں راست ر اس پڑھا جائے گا اور اگر آخر مصرع میں تین ساکن جمع ہوں گے تب بھی دو ساکن بجل رہیں گے اور تیسرا دور ہو جائے گا مثلاً والستہ ہے تجھ سے اپنی یاں زلیست اس کو یوں پڑھا جائے گا والستہ تجھس آپن یا زلیس مخفربہ کہ تین ساکن اوزان میں کبھی جمع نہیں ہوتے۔ بعض الفاظ لفظ میں تو آتے ہیں لیکن تحریر میں نہیں آتے مثلاً آمد ۱۱ م آیا

طاؤس :- طاؤس اسی طرح حرف مشددا در متوزین مثلاً خرم خرم فوراً فوراً زیر کسرہ اگر کھینچ کر پڑھا جائے تو وہ بھی ایک حرف شمار ہوگا مثلاً زیر فلک کو اگر زیرے فلک پڑھا جائے تو زیر کی کسرہ بھی تقطیع میں شمار ہوگی۔



۱۱۔ حروف علت (اُذی) بعض ادقات الفاظ کے ساتھ اس طرح آتے ہیں کہ ان کا تلفظ بہت مختصر ہوتا ہے ایسی صورت میں ان کے ماقبل کی حرکت تقطیع میں شمار ہوگی۔ مثلاً مجھ کو تھا اس شخص سے بس اتحاد۔ اس مصرع میں "کو" تھا، اور "سے" کے حرف علت شمار نہ ہوں گے۔

۱۲۔ اکثر جگہ رکن بحر میں سکون ہوتا ہے اور شعر میں اس جگہ متحرک ہوتا ہے تو اس کو بالضرورت تقطیع میں ساکن کر لیتے ہیں۔ مثلاً سے ہم نے بات نہ میری مانی۔ اس مصرع میں "بات نہ" کو باتن پڑھیں گے۔ ورنہ فعلن۔ خلاصہ یہ ہے کہ تقطیع میں صرف وہی الفاظ شمار کئے جاتے ہیں جو زبان سے نکلیں اور اسی قدر شمار کئے جاتے ہیں جس قدر کہ وہ زبان سے ادا ہوں یعنی (۱۔ ۲ یا ۳۔) لکھے وہ چاہے جیسے ہوں۔

تقطیع کرنے کے لئے تلفظ کے اصول اور آوازوں کی تین قسمیں جاننے کے بعد اب یہ بتانا ضروری ہے کہ ہماری شاعری میں یہ نہیں ہوتا کہ ان آوازوں کو فرداً فرداً پیش نظر رکھیں بلکہ ان آوازوں کے کچھ مجموعے بنائے جاتے ہیں اور تقطیع کرنے میں یہی آوازوں کے مجموعے شمار میں رکھے جاتے ہیں۔ یہ مجموعے ہمارے قدیم عروضیوں نے متعین کئے ہیں۔ ہر مجموعہ دو، تین، چار یا پانچ آوازوں کی شرکت پر مشتمل ہوتا ہے۔ آوازوں کے اس قسم کے مجموعے کو "رکن" کہتے ہیں، اور ان ارکان کو چند بے معنی الفاظ مثلاً فاعلن یا فاعلنا وغیرہ سے ظاہر کرتے ہیں تاکہ ان الفاظ کے تلفظ سے آوازوں کے حرکات اور سکون ٹھیک ٹھیک ظاہر ہو جائیں۔ مثلاً فاعلن کی شکل یہ ہوگی (۱۔ ۲۔ ۳۔) فاعلن



کی آوازوں کا مجموعہ اس طرح ظاہر ہو سکے گا۔ (۸۔۔۔) وغیرہ وغیرہ۔ یہ  
 بے معنی الفاظ یا ارکان تعداد میں کل دس ہیں (۱) مُتَفَاعِلُن (۸۸۔۸۔۔) (۲)  
 مُتَفَاعِلَتُن (۸۸۔۸۔۔) (۳) مُتَفَاعِلُن (۸۸۔۔۔۔) (۴) فَا عَلَاتُن (۸۔۔۔) (۵)  
 فَا عَلَاتُن (۸۔۔۔) (۶) مُسْتَفْعِلُن (۸۔۔۔) (۷) مُسْتَفْعِلُن (۸۔۔۔) (۸)  
 مُتَفَعُّوْلَاتُ (۸۔۔۔) (۹) فَعُوْلُن (۸۔۔۔) (۱۰) فَا عَلُن (۸۔۔) انہیں ارکان  
 میں سے جب کوئی ایک رکن یا آوازوں کا مجموعہ کسی مصرعے یا شعر میں متواتر آتا ہے  
 تو اسے نامزد کر دیتے ہیں کہ یہ فلاں نام کی بحر ہے یعنی اصطلاح میں کسی ایک مجموعے  
 کی تکرار کو بحر کہتے ہیں۔ گو یا وہ شعر ایک سمندر ہے جس میں کسی خاص صوتی  
 ترتیب کی لہریں اٹھ رہی ہوں۔

بحروں کی کل تعداد انیس ہے اور وہ اس طرح پر ہیں۔

- |         |                                    |                  |            |
|---------|------------------------------------|------------------|------------|
| نام بحر | پانی لفظی علامت جس کو رکن کہتے ہیں | تعداد آواز لفظ   | علامت صوتی |
| ۱۔ کامل | مُتَفَاعِلُن                       | (پانچ آوازی لفظ) | ۸۸۔۸۔۔     |
| ۲۔ وافر | مُتَفَاعِلَتُن                     | (پانچ آوازی لفظ) | ۸۸۔۸۔۔     |
| ۳۔ ہزج  | مُتَفَاعِلُن                       | (چار آوازی لفظ)  | ۸۔۔۔۔      |
- پہلی اور چوتھی آواز مختصر دوسری تیسری اور پانچویں مکمل  
 پہلی تیسری اور چوتھی آواز مختصر دوسری اور پانچویں مکمل  
 پہلی آواز مختصر اور بعد کی تین مکمل

۱۔ لیکن ہماری اردو شعر و شاعری میں صرف چھ ارکان عموماً مستعمل ہیں۔ ارکان ۲ و ۳ و ۴  
 شاذ ہی استعمال کئے گئے ہیں۔ ۵ و ۶ بھی بہت کم۔ ن



۴۔ زَلّ فاعِلان یا فاعِلان چار آوازی لفظ { = = = }  
 پہلی آواز مکمل، دوسری مختصر، یا ساکن، تیسری اور چوتھی مکمل

۵۔ رَجَز مُستفعلن یا مُستفعلن چار آوازی لفظ { = = = }  
 پہلی دو آوازیں مکمل تیسری مختصر یا ساکن اور چوتھی مکمل

۶۔ مُتقارب فعولن (سہ آوازی لفظ) ( = - )  
 پہلی آواز مختصر، دوسری اور تیسری مکمل

۷۔ مُتدارک فاعِلن (سہ آوازی لفظ) ( = - )  
 دوسری آواز مختصر، پہلی اور تیسری مکمل

یہ سات بحریں ایک ہی مقررہ رکن مندرجہ بالا (یا اس کی کچھ بگڑی ہوئی صورت یعنی زحافات لے) سے بنتی ہیں مثلاً بحر ہزج میں رکن مفاعیلن ہی کسی مصرعہ میں دو یا تین یا چار بار آئے گا لے اس لئے ان سات بحرہوں کو ہم مفرد بحر میں کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ ایک ہی رکن کی تکرار سے بنتی ہیں۔ بقیہ بارہ بحر میں انہی مندرجہ بالا ارکان کو دو دو یا تین تین ملا کر ایک مرکب بحر بنالیتے ہیں اور اس کا ایک نام رکھ دیتے ہیں ذیل میں بقیہ بارہ مرکب بحر

لے زحافوں کا بیان آگئے آئے گا۔ ۲۔ اگر کسی مصرع میں تین ہی رکن ہوں تو دونوں مصرعوں میں ملا کر چھ ہوئے اس لئے ایسا بحر کو سدس کہتے ہیں اور اگر ایک مصرعہ میں چار رکن ہوں تو دونوں مصرعوں میں ملا کر آٹھ ہوئے ایسا بحر کو شمن کہتے ہیں۔ تین رکن سے کم اور چار سے زیادہ عموماً کسی بحر میں نہیں آتے۔ بعض دفعہ اس سے کم یا زیادہ بھی استعمال کئے جاتے ہیں دو ہوں تو مربع کہتے ہیں، آٹھ ہوں تو سولہ رکنی وغیرہ وغیرہ۔



لکھی جاتی ہیں۔

۸۔ مضارع :- مفاعیلن فاعلاتن مفاعیلن فاعلاتن

مثنیٰ

۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔

۹۔ قریب :- مفاعیلن مفاعیلن فاعلاتن

مدرس

۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔

۱۰۔ شاکل :- فاعلاتن مفاعیلن مفاعیلن

مدرس

۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔

۱۱۔ جدید :- فاعلاتن فاعلاتن مستفعلن

مدرس

۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔

۱۲۔ خفیف :- فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن

مدرس

۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔

۱۳۔ مجتث :- مستفعلن فاعلاتن مستفعلن فاعلاتن

مثنیٰ

۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔

۱۴۔ بسیط :- مستفعلن فاعِلین مستفعلن فاعِلین

مثنیٰ

۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔

۱۵۔ طویل :- فاعِلین مفاعیلن فاعِلین مفاعیلن

مثنیٰ

۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔

۱۶۔ مدید :- فاعلاتن فاعِلین فاعلاتن فاعِلین

مثنیٰ

۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔ ۸۔۔۔۔۔











میں محسوس ہوتی ہے لیکن یہ یاد رکھئے کہ 'فاعِلن' اگر کسی بڑے رکن مثلاً فاعِلاتن  
 مستفعلن وغیرہ کے ساتھ آئے تو زحاف ہوگا۔ اور تنہا آئے تو بحر متدارک  
 شمار ہوگا، یعنی آخر کی ایک کمل آواز (۔) کم ہو جائے یا (۳) کوئی ایک آواز کسی قسم  
 کی پورے رکن سے بڑھ جائے مثلاً متفاعِلن (۸ - ۸ - ۸ -) سے متفاعِلاتن  
 (۸ - ۸ - ۸ -) ہو جائے (لیکن یہ آخری تیسری صورت ہمارے یہاں اُردو شاعری  
 میں شاذ ہی برتی جاتی ہے اس لئے اسے ہم یہاں نظر انداز کریں گے) ان سب  
 صورتوں کو کہتے ہیں کہ رکن میں "زحاف" آگیا۔ یا بحر مزاحف ہو گئی لہ پورے  
 علم عروض میں مفرد اور مرکب زحافوں کی تعداد تو تقریباً اڑتالیس ہے لیکن اُردو  
 شاعری میں عموماً پندرہ سولہ زحافات کام میں آتے ہیں۔ اگر صرف یہ زحاف یاد  
 ہو جائیں تو بقیہ کے جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے لہ۔

لہ۔ لفظ زحاف کو لغوی معنی ہیں تیر کا نشانہ پر پہنچنے سے پہلے گر پڑنا۔ لہ اور جو لوگ ان  
 پندرہ سولہ زحافات کو بھی یاد نہ کرنا چاہیں وہ صرف بحروں کے نام یاد کر لیں اور انہیں پہچاننا  
 جان لیں اور اگر کسی بحر میں زحاف آجائے تو وہ اس کی تقطیع اتنا لکھ کر سکتے ہیں کہ یہ فلاں  
 بحر زحاف ہے مثلاً ذیل کے شعر کی تقطیع وہ صرف یہ لکھ کر سکتے ہیں کہ یہ بحر ہزج مع زحاف ہے  
 لہ ردھ گیا کوئی اب دیکھئے کیا ہوگا  
 مفعول مفاعیلن مفعول مفاعیلن

--- ۸ ۸ - - - ۸ ۸ - - -



ذیل میں ان زحافات کی صوتی صورتیں پیش کی جاتی ہیں جو اردو شاعری میں عموماً مستعمل ہیں۔ صوتی اعتبار سے انہیں تقسیم کرنا ان کو جاننے اور پہچاننے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

الف: وہ صورتیں جن میں رکن تو پورا استعمال ہوتا ہے لیکن کسی ایک یا دو آوازوں کی شکل بدل جاتی ہے۔  
۱۔ مستغ: جب کسی رکن کے آخر میں مکمل آواز (۔) ہو اس پر ساکن (۴) کا اضافہ ہو جائے مثلاً

مفاعیلن (۔۔۔۔۸) سے مفاعیلان (۶۔۔۔۔۸)

فعولن (۔۔۔۸) سے فعولان (۶۔۔۔۸)

فاعلاتن (۔۔۔۸) سے فاعلاتان (۶۔۔۔۸) اسے فاعلیان

کے لفظ سے بدل دیتے ہیں۔

نوٹ:۔۔ یہ جائز ہے کہ شعر کا ایک مصرعہ سالم ہو اور دوسرا مستغ لے  
۲۔ کفون: جب کسی رکن کی آخری آواز مکمل (۔) ہو اور وہ مختصر (۸)

ہو جائے۔ مثلاً مفاعیلن (۔۔۔۔۸) سے مفاعیل (۸۔۔۔۔۸)

مستفعلن (۔۔۔۔۸) سے مستفعل (۸۸۔۔۔۔۸)

فاعلاتن (۔۔۔۸) سے فاعلات (۸۔۔۔۔۸)

۳۔ صرف ان صورتوں میں جب مصرعوں کے آخر کا فون غنہ تقطیع میں شمار کیا جائے۔

دیکھو نوٹ صفحہ ۱۹۷ اور اگر اسے شمار نہ کیا جائے تو یہ اجازت صرف مزاحف اور مرکب بحرین تک محدود ہوگی سالم بحرین میں نہیں۔ ن



۳۔ مجنون :- جب کسی رکن کی پہلی مکمل آواز (د) مختصر (م) ہو جائے تو  
مثلاً مستفعلن (د - - - م - - -) سے مستفعلن (م - - - م - - -) اسے مفاعیلن  
شمار کرتے ہیں۔

فاعلاتن (د - - - م - - -) سے فاعلاتن (م - - - م - - -)

فاعیلن (د - - - م - - -) سے فاعیلن (م - - - م - - -)

۴۔ مطوی :- جب کسی رکن کی دوسری مکمل آواز (د) مختصر (م) ہو جائے :-  
مثلاً مستفعلن (د - - - م - - -) سے مستفعلن (م - - - م - - -) اسے مستفعلن کہتے ہیں۔  
۵۔ مقبوض :- جب کسی رکن کی تیسری مکمل آواز (د) مختصر (م) ہو جائے :-  
مثلاً فعلن (د - - - م - - -) سے فعلن (م - - - م - - -)

مفاعیلن (د - - - م - - -) سے مفاعیلن (م - - - م - - -)

۶۔ مشکول :- جب کسی رکن کی پہلی اور آخری مکمل آوازیں (د) مختصر (م) ہو جائیں  
مثلاً فاعلاتن (د - - - م - - -) سے فاعلات (م - - - م - - -)  
مستفعلن (د - - - م - - -) سے مستفعل (م - - - م - - -) = مفاعیل

۷۔ مقصور :- جب کسی رکن کے آخر کی مکمل آواز (د) ساکن (ص) ہو جائے :-

مثلاً مفاعیلن (د - - - م - - -) سے مفاعیل (ص - - - م - - -)

فاعلاتن (د - - - م - - -) سے فاعلات (ص - - - م - - -)

فعلن (د - - - م - - -) سے فعلن (ص - - - م - - -)



(ب) وہ صورتیں جن میں آواز گھٹ جاتی ہے یا گھٹنے کے بعد بقیہ آوازوں میں کچھ تبدیلی ہو جاتی ہے۔

۷۔ مخدوف :- جب کسی رکن کے آخر میں دو مکمل آوازیں (۔۔) ہوں ان میں سے ایک گھٹ جائے اور صرف ایک باقی رہ جائے۔  
مثلاً فاعِلن (۔۔) سے فَعُولن (۔۔) = فَعْل

مفاعیلن (۔۔۔) سے مفاعی یا فاعِلن (۔۔)

۹۔ مقطوع :- جب کسی رکن کے آخر کی دو آوازیں اس طرح ہوں کہ آخری مکمل ہو اور اُس سے پہلی مختصر (۔) اور ان میں سے مکمل آواز گر جائے اور بقیہ مختصر مکمل ہو جائے۔

مثلاً فاعِلن (۔۔) سے فاعِ یا فَعْلُن (۔۔)

مستفعلن (۔۔۔) سے مُسْتَفْعِ یا مفعولن (۔۔۔)

مُتَفَاعِلُن (۔۔۔) سے مُتَفَاعِ یا فُعِلَاتُن (۔۔۔) وغیرہ

۱۰۔ مُسْکُن :- جب کسی رکن کی تمام آوازیں گر کر صرف دو مکمل آوازیں (۔۔) رہ جائیں مثلاً فاعِلَاتُن (۔۔۔) سے فاعِلُن (۔۔)

فَاعِلُن (۔۔) سے فَعْلُن (۔۔) وغیرہ

فَاعِلُن (۔۔) سے فَعْلُن (۔۔) وغیرہ

۱۱۔ اِثْم اور مقطوع کی وہ شکل جو فاعِلُن بن جاتی ہے یہ سب مُسْکُن بھی کہے جاسکتے ہیں بعض عرضی مُسْکُن کی جگہ مقطوع ہی کہتے ہیں ورنہ ان سب صورتوں کو صرف مُسْکُن لکھا جاسکتا ہے۔ اِثْم کی تشریح کے متعلق دوسرا صفحہ ملاحظہ کیجئے۔ ن















ہرج مٹمن اُخرب مَکفوف مَحذوف (مفعولُ، مفاعیلُ مفاعیلُ فاعِلن)

( - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - )

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے  
غم کانِ اہم بودا دلِ ناکام بہت ہے

( - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - )

ہرج مٹمن اشترا فاعِلن مفاعیلن فاعِلن مفاعیلن

( - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - )

عشق سے طبیعت نے زلیست کا مزا پایا  
عشق سے طبیعت نے زلیں کا مزا پایا

( - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - )

ہرج مسدس مَحذوف (مفاعیلن، مفاعیلن، فاعِلن، فاعِلن، فاعِلن، فاعِلن)

جس انسان کو سبک دنیا نہ پایا  
جس سنا کو، سگے دنیا، لک پایا

( - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - )

ہرج مسدس مقبوض مَحذوف (مفعولُ مفاعِلن فاعِلن - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - )

طوفاں مری چشم تر سے اٹھا  
طوفاں، ریشم تر، س اٹھا

( - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - ۸، ۸ - - - )

۴۔ رل مٹمن مَحذوف (فاعِلتن فاعِلتن فاعِلتن فاعِلتن فاعِلتن)



پھول تو دودن بہارِ جاں فزا دکھلا گئے  
 پُول تو دو، دن ب ہارے، جاں زارِ ک، لاگت اے

- ۸ - ، - ۸ - ، - ۸ - ، - ۸ -

رملِ مثنوی مجنون محذوف (فاعلاتن، فَعْلَاتن، فَعْلُن، فَعْلُن)

( - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - )

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اس کو سناے نہ بنے  
 رملِ مثنوی مجنون محذوف مسکن (فاعلاتن، فَعْلَاتن، فَعْلُن، فَعْلُن)

( - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - )

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا  
 رملِ مثنوی مشکول (فَعْلَات، فاعلاتن، فَعْلَات، فاعلاتن)

( - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - )

وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا  
 وہ ذبح، بی ک رے ہے، وہ لے ث، و اب الٹا

( - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - )

رملِ سدس محذوف (فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن)

( - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - )

دل مرا اُس پر نکلتا ہی رہا

رملِ سدس مجنون محذوف (فاعلاتن، فَعْلَاتن، فَعْلُن، فَعْلُن)

( - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - ، - ۸۸ - )



وہ ستم کر کے پشیمان نہ ہوا  
رمل مسدس مجنون مخدوف مسکن (فاعلاتن، فعلتن، فاعلان،

۸ - - - ۸ ۸ - - - ۸ - - - یا - - - ۷)

اُن کی باتیں ہیں ستم کی باتیں  
۵۔ بحر متدارک مثنیٰ سالم (فاعلتن - ۸ - چار بار)  
رٹ گئے عشق میں امتحاں ہو چکا

بحر متدارک مجنون (فعلتن ۸ - چار بار)  
کبھی وعدہ کسی کا وفا نہ ہوا  
بحر متدارک مجنون مسکن (فعلتن - - - چار بار)  
آنسو کوئی نکلا ہوتا

بحر متدارک مجنون ۱۶ رکنی (فعلتن ۸ ۸ - ۱۶ مرتبہ)  
نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے  
بحر متدارک مجنون مسکن ۱۶ رکنی (فعلتن - - - ۱۶ مرتبہ)

فرقت میں کیا گزری دل پر تم نے یہ تو پوچھا تو ہوتا  
۶۔ بحر متعارف مثنیٰ سالم (فعلتن ۸ - - - چار بار)  
جو اس شور سے سیر رہتا رہے گا تو ہمایہ کا ہے کو سوتا رہے گا  
بحر متعارف مثنیٰ مسبق (آخری رکن فعلان ۸ - - - ۷)

کلیجے سے ان کو لگائے ہوئے ہیں  
بحر متعارف مثنیٰ مخدوف (آخری رکن مختصر ہو کر فعل ۸ - - - رہ جائے)



شب وصل ضد میں بسر ہو گئی  
 بحر متقارب مثنیٰ مقصورہ آخری رکن کی شکل فعل (۸-۷) ہو جائے  
 وہ نالے ہیں جن میں اثر کچھ نہیں

یا  
 محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور  
 بحر متقارب مثنیٰ اثرم (فعل، فعلن، فعل - ۸، - - - دوبار)  
 درد ہمارا کیا وہ کئے گا  
 بحر متقارب مثنیٰ اثرم ۱۶ رکنی

دے کے چلا آئینہ دل کو نور کیا ہے شیر خدانے  
 بحر متقارب مثنیٰ اٹلم (فعلن، فعلن - - - ۸، - - - دوبار)  
 آخر نہ اس نے پکیاں نکالا  
 بحر متقارب مثنیٰ اٹلم مسغ (فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن)  
 روکھے ہوئے دل کو کیوں کر منائیں

بحر متقارب مقبوض اٹلم ۱۶ رکنی (فعلن، فعلن یا فعلن (۸-۸، - - - چار بار)  
 سدا ہے اُس آہ و حشم تر سے فلک پہ بجلی زمیں پہ باراں

متقارب مقبوض اثرم محذوف ۱۶ رکنی  
 (فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن، فعلن)

- - - - - ۸ - - - - - ۸ - - - - - ۸ - - - - - ۸ - - - - -

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا















کلام آتی ہیں۔ اس لئے ہمارے عروضیوں نے ان کو مثنویوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے اور اب عموماً انھیں بحروں میں مثنویاں کہی جاتی ہیں۔ وہ بحر یہ ہیں۔

۱۔ ہزج مسدس اخر ب مقبوض: مفعولُ مفاعِلُنْ مفاعیلُ یا فَعُولُنْ۔ فیضی کی نظم من۔ نظامی کی یسلی مجنوں۔ نسیم کی گلزار نسیم اسی بحر میں لکھی گئی میں مثال سے شبنم کے سوا چرانے والا

۲۔ ہزج مسدس مخدوف: مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل یا فَعُولُنْ۔ نظامی کی شیریں خسرو۔ جامی کی یوسف زلیخا۔ مثال سے نہیں کوئی برائی سر سے پاتک

۳۔ رمل مسدس مقصور: فاعلاتن فاعلاتن فاعِلن یا فاعلات۔ رومی کی مثنوی معنوی، عطار کی منطق الطیر، میر کی مثنوی ہولی آصف الدولہ اسی میں لکھی گئی ہیں مثال سے ہولی کھیلا آصف الدولہ وزیر

۴۔ رمل مسدس مجنون: فاعلاتن، فاعلاتن، فاعِلن یا فاعلات:۔ جامی کی سبوحہ الابرار مثال سے پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا

۵۔ سریع مسدس مطوی: مُفْعِلُنْ مُفْعِلُنْ، فاعِلُنْ یا فاعِلان: نظامی کی مخزن الاسرار وغیرہ مثال سے بہت کلید درگج حکیم

۶۔ سریع مسدس مطوی مقطوع: فَعْلُ فَعُولُنْ، فَعْلُنْ نَعْ یا فاع، میر کی مثنوی جوش عشق مثال سے ضبط کروں میں کب تک آہ

۷۔ خفیف مسدس مخدوف: فاعلاتن مفاعِلن فاعِلن یا فاعلات: شوق لکھنوی کی مثنوی زہر عشق۔ میر کی مثنوی دریا کے عشق مثال سے۔ بان گل کے لئے بناتے جا میں











صورتوں کے ہوں۔ مگر وہ کسی ایک شجرہ کی کسی صورت کے مطابق ضرور ہوں  
یعنی حتی الامکان ایک شجرہ کے مصرعے کے ساتھ دوسرے شجرہ کا مصرع نہ  
موزوں کریں۔

اب چند رباعیاں درج کی جاتی ہیں۔ ان کی تقطیع کر کے دیکھئے۔  
گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں  
یا معدن کوہ و دشت و دریا دیکھوں

ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے  
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں  
(انہیں)

ناداں کہوں دل کو کہ خرد مند کہوں  
یا سلسلہ وضع کا پابند کہوں

اک روز خدا کو منہ دکھا ناہر و ہیر  
کس منہ سے میں بندوں کو خداوند کہوں  
(دہیر)

سامان خور و خواب کہاں سے لاؤں  
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں

روزہ مرا ایمان ہے غالب لیکن  
خس خانہ و برف و آب کہاں سے لاؤں  
غالب



